اُستاد بڑے غلام علی خان

(فن اور حالاتِ زندگی)

تصنیف و تالیف

مالتی جیلانی۔ قرأۃ العین حیدر

ترجمہ

محمود احمد مودی

دارالاشاعت

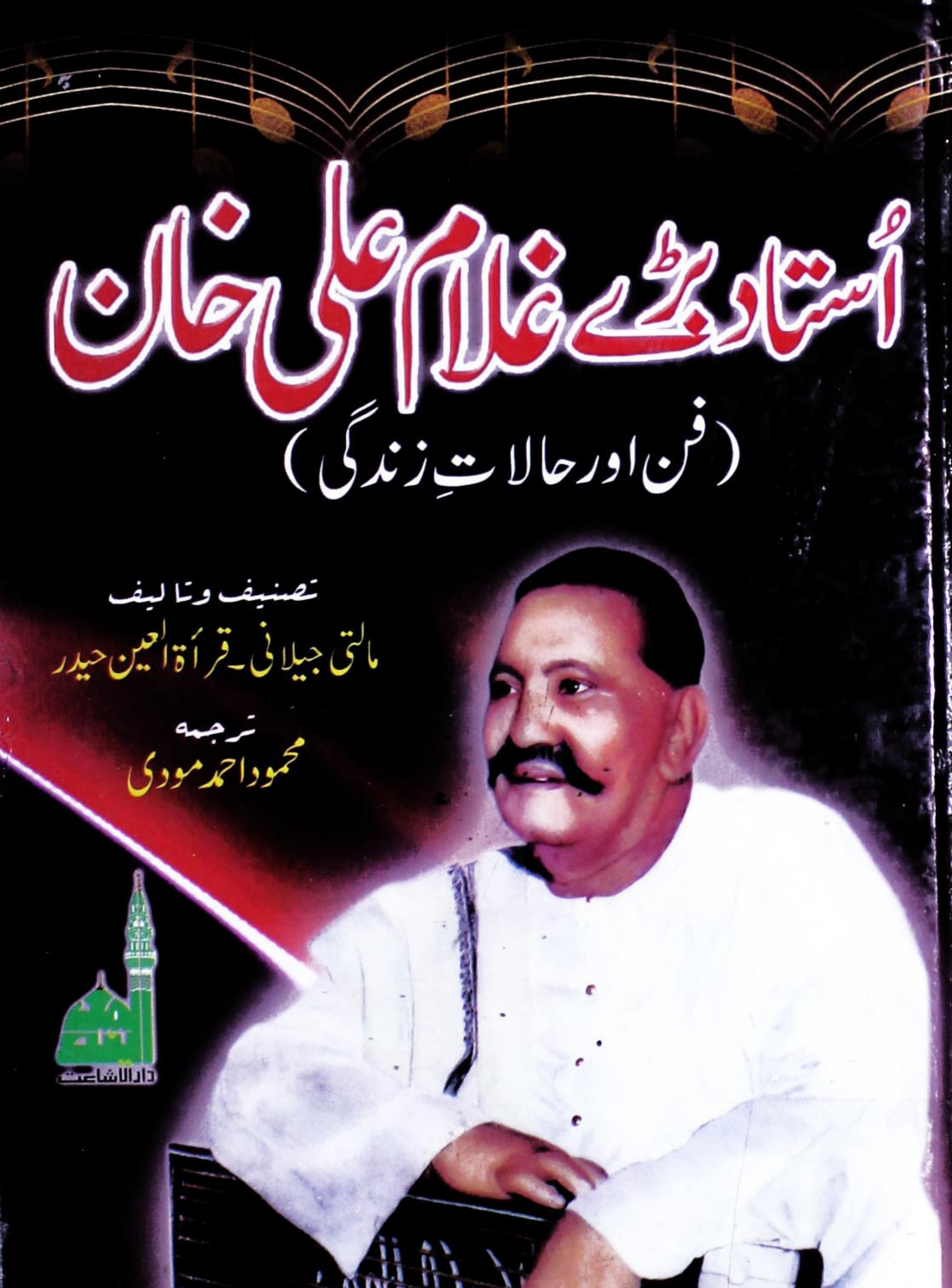

Marfat.com

Marfat.com

اُستاد بڑے غلام علی خان

(12اپریل 1902ء تا 23اپریل 1968ء)

Marfat.com

اُستاد بڑے غلام علی خان

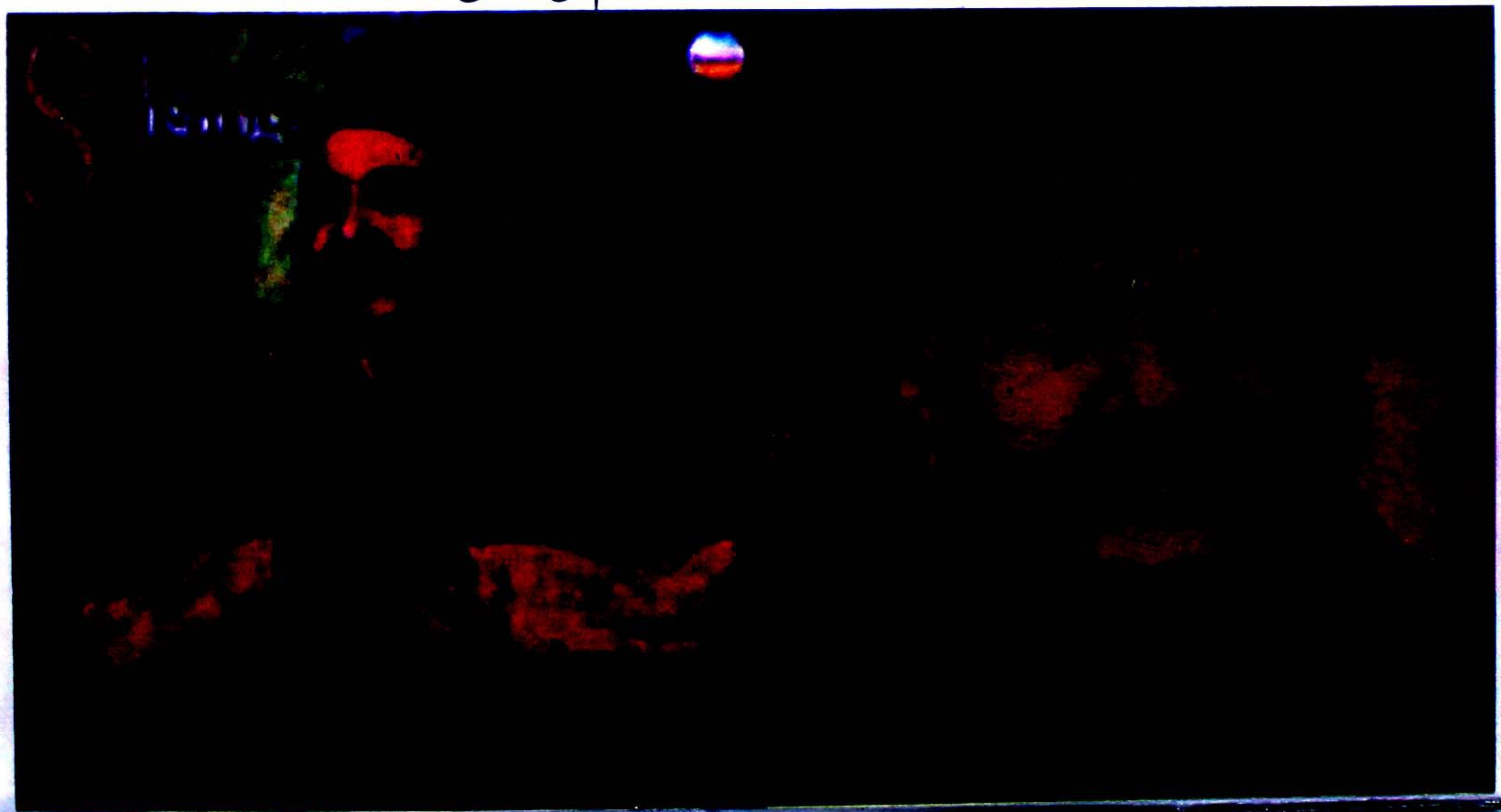

Marfat.com

اگست 1995ء میں ہونے والے پروگرام ''سب رنگ اُستاد''
میں مالتی جیلانی اور قرۃ العین حیدر مشعل روشن کرتے ہوئے

Marfat.com

حضرت بلّھے شاہ رحمۃ اللہ علیہ کے مزار کا اندرونی منظر (قصور)

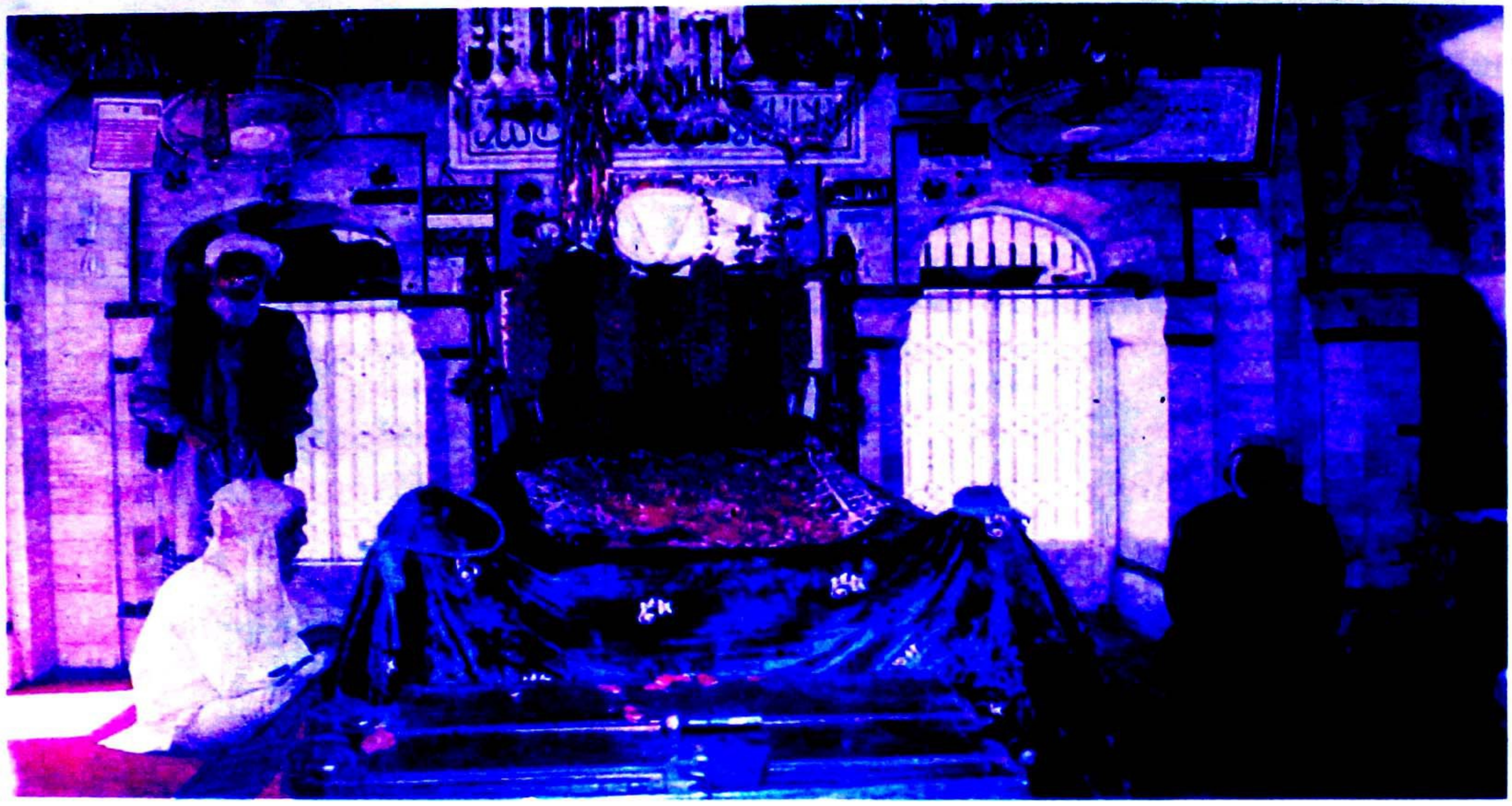

Marfat.com

مزار بابا پیر فضل داد

Marfat.com

چوبرجی

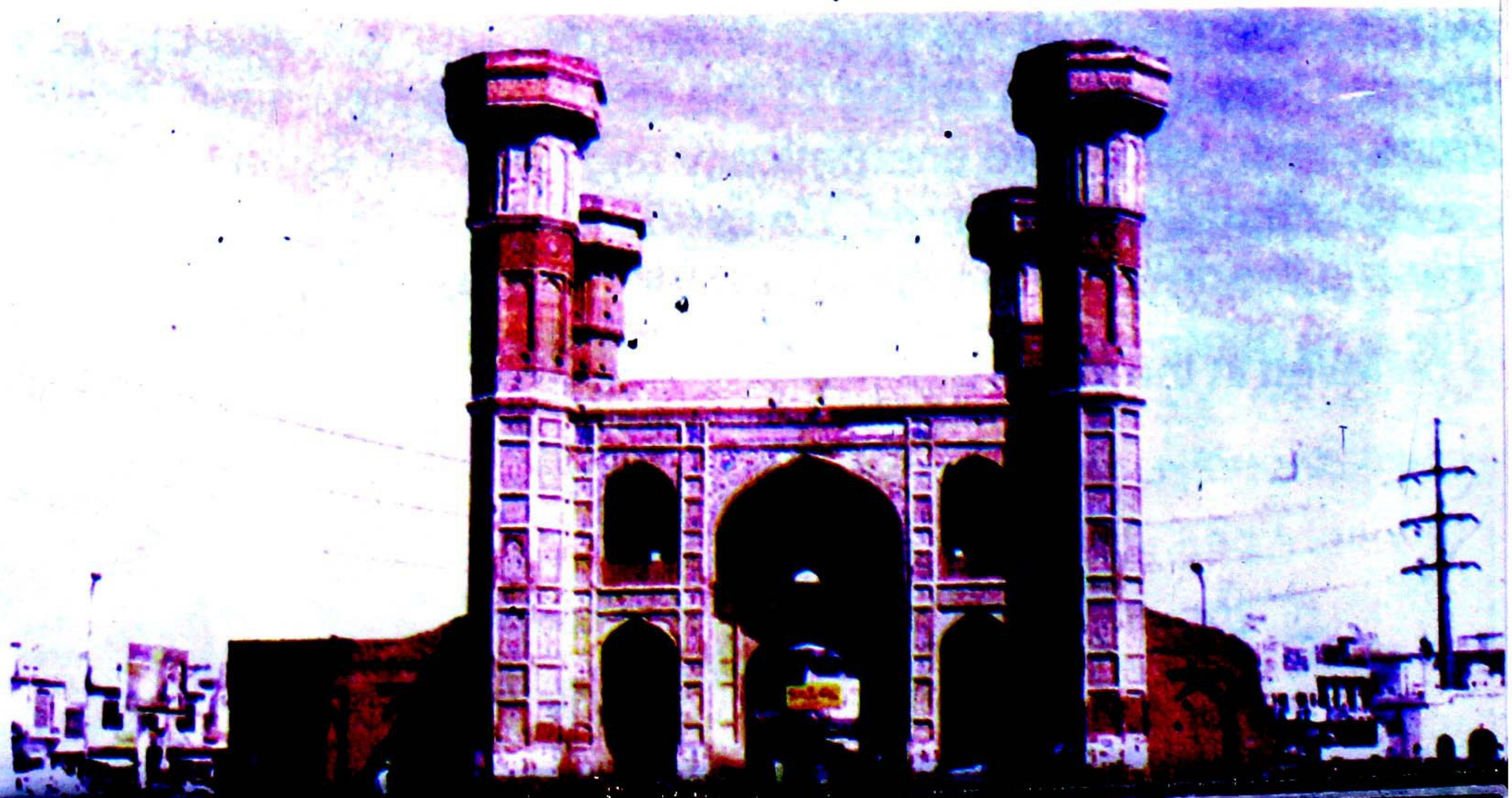

Marfat.com

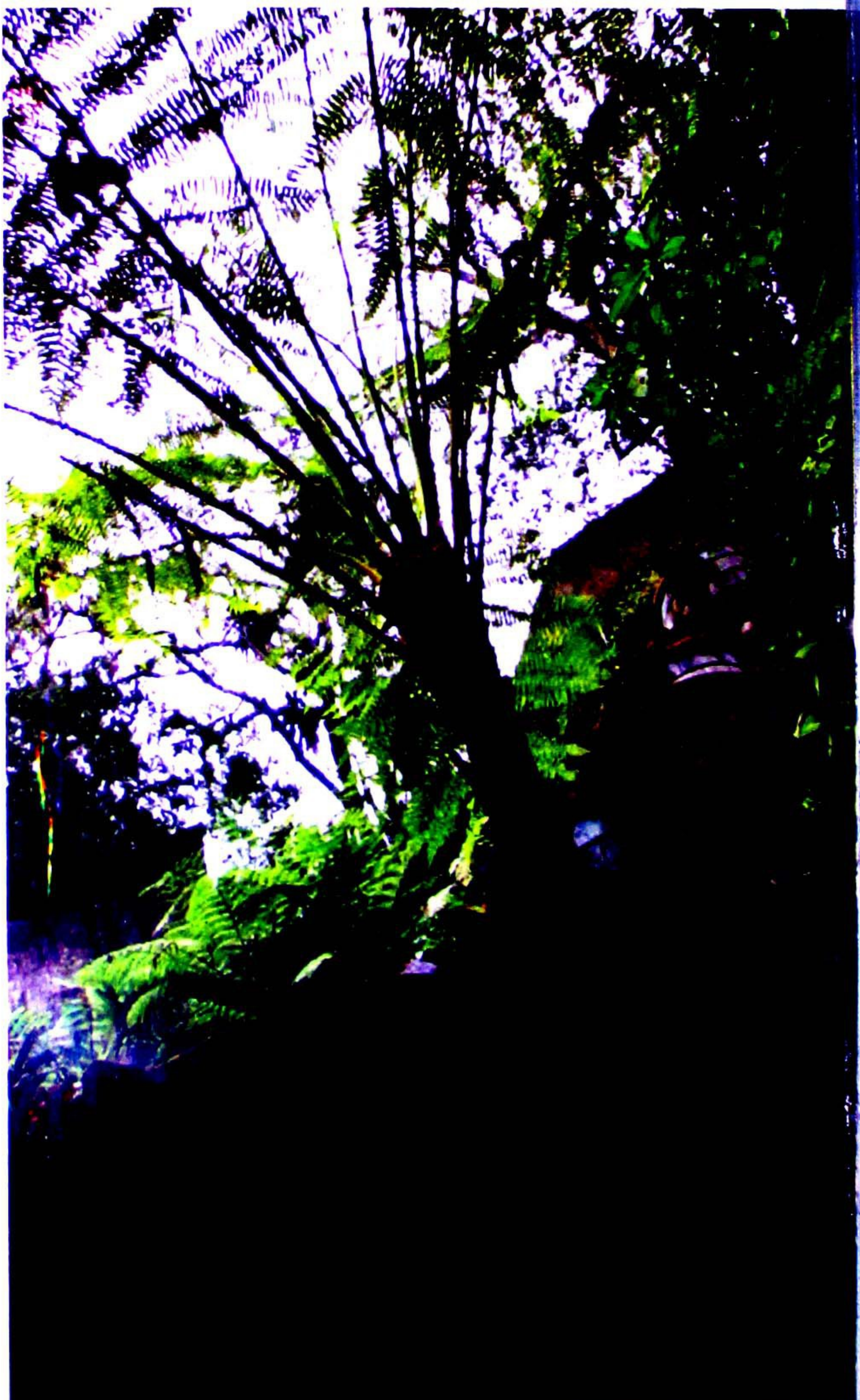

Marfat.com

صاحبزادہ بڑے غلام علی خان

Marfat.com

اُستاد منور علی خان کے صاحبزادے اُستاد رضا علی خان

Marfat.com

اُستاد بڑے غلام علی خان کے پوتے اور اُستاد کرامت علی خان
کے صاحبزادے اُستاد جواد علی خان اور اُستاد مظہر علی خان

Marfat.com

مالتی جیلانی صدی پروگرام (10 نومبر 2002ء)
میں اپنے فن کا مظاہرہ کرتے ہوئے

Marfat.com

ایم۔ایف حسین اور مالتی جیلانی۔۔(دیوار پر حسین صاحب کی بنائی ہوئی اُستاد بڑے غلام علی خان کی تصویر)

Marfat.com

(بائیں سے دائیں) میر ابنیر جی، میمونہ اہوجا، مالتی جیلانی اور اُستاد آرفہیم الدین ڈوگر

Marfat.com

اُستاد بڑے غلام علی خان کی یادگار سبھا کے زیر اہتمام ''سب رنگ اُستاد 2000'' (انڈیا انٹرنیشنل سنٹر، نیو دہلی)

Marfat.com

صدی پروگرام (10 نومبر 2002ء) کا خوشگوار اختتام

Marfat.com

آخری آرام گاہ اُستاد بڑے غلام علی خان
دیار امیر مومن (حیدر آباد) 23 اپریل 1968ء

Marfat.com

استاد بڑے غلام علی خان

(فن اور حالات زندگی)

تصنیف و تالیف: مالتی جیلانی، قراۃ العین حیدر

ترجمہ: محمود احمد مودی

المدینہ دارالاشاعت

یوسف مارکیٹ، غزنی سٹریٹ، 38- اُردو بازار، لاہور (پاکستان)

فون: 7320682-7312801

Marfat.com

111087

استاد بڑے غلام علی خان.....فن اور حالات زندگی

اردو ایڈیشن کے جملہ حقوق بنام نواب میر شفیع محمد خان جمالی محفوظ ہیں

نام کتاب : استاد بڑے غلام علی خان (فن اور حالاتِ زندگی)

مصنفہ و مؤلفہ : مالتی جیلانی، قراۃ العین حیدر

مترجم : محمود احمد مودی

ناشر : نواب میر شفیع محمد خان جمالی

تزئین و آرائش : محمد ابرار حنیف مغل (0300-4313913)

بار اول : 2008ء

تعداد : ایک ہزار

قیمت : [redacted]

مقام اشاعت : المدینہ دارالاشاعت

یوسف مارکیٹ، غزنی سٹریٹ، 38-اُردو بازار، لاہور

فون: 7320682-7312801

Marfat.com

USTAD BADE GHULLAM ALI KHAN
His Life and Music

Bade Ghulam Ali Khan
April 2, 1902 to April 23, 1968

Marfat.com

Ustad Bade Ghulam Ali Khan
"He touched my soul"
A tribute by M.F. Husain painted in 1969

Marfat.com

فہرست

1. ابتدائیہ 7
2. کچھ کتاب کے بارے میں 14
3. تعارف 17
4. سرکی دیوی کی تلاش 30
5. موسیقی کا ورثہ 34
6. غلام علی کی پیدائش اور بچپن 36
7. نوجوان غلام علی کی شہر سے شناسائی 55
8. دریائے بیاس کے کنارے ریاض 60
9. نوجوانی میں صدمہ 78
10. ایک انوکھا رومان' ایک عجیب عشق 86
11. بمبئی میں آمد .....
12. سفر در سفر .....
13. بیگم اللہ رکھی سے شادی 111

Marfat.com

14. تقسیم ہند 115
15. داتا غریب نواز رحمتہ اللہ علیہ کے مزار پر حاضری 129
16. کلکتہ میں قیام 132
17. آشرم میں محفل موسیقی 149
18. علی پور جیل میں محفل موسیقی 155
19. شعلہ بجھنے سے پہلے 165
20. اور سورج ڈوب گیا 177
21. روایتوں کے امین 189

☆☆☆☆☆☆☆☆

Marfat.com

ابتدائیہ

مجھے خوشی ہے کہ میری کاوشوں اور ذاتی دلچسپی کی بدولت کلاسیکی موسیقی کے قدردانوں ..... اور خصوصاً استاد بڑے غلام علی خان صاحب کے فن اور حالات زندگی کے بارے میں ایک ایسی کتاب آپ کی خدمت میں پیش کی جا رہی ہے جو نہایت مستند ہونے کے ساتھ ساتھ بے حد دلچسپ اور عام فہم بھی ہے۔ موسیقی اور گائیکی کی دنیا کی اس دیو قامت شخصیت کے بارے میں یوں تو تمام ضروری مواد آپ کو آئندہ صفحات میں مل جائے گا لیکن ہمیشہ کے طور پر میں اپنی ذاتی معلومات اور خیالات کے اضافے کے ساتھ کچھ بنیادی باتیں بیان کرتا چلوں۔

استاد بڑے غلام علی خان قصور میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے موسیقی کی ابتدائی تعلیم اپنے والد استاد علی بخش خان اور چچا استاد کالے خان صاحب سے حاصل کی۔ یہ دونوں اساتذہ پٹیالہ گھرانہ کے استاد فتح علی خان کے شاگرد تھے۔ استاد فتح علی خان کا مرتبہ ''نائیک'' کا بھی تھا کیونکہ انہوں نے کئی نئے راگ دریافت کیے اور نئی عمدہ راگنیاں بھی تیار کیں۔ مثلاً راگ پہاڑی ..... جو پہاڑی اور صحرائی علاقوں میں اونٹ اور بکریاں چرانے والوں کا مقامی راگ تھا مگر وہ اس پر غیر منظم انداز میں مختلف بول گاتے تھے۔ استاد فتح علی خان کو ان کا گانے کا انداز اچھا لگا تو انہوں نے اسے

Marfat.com

باقاعدہ طور پر موسیقی میں شامل کرنے کے لئے صحیح طور پر ترتیب دیا' اس کی سرگم بنائی اور آج راگ پہاڑی ایک مشہور اور مقبول راگ ہے۔ استاد علی بخش خان اور استاد کالے خان نے استاد فتح علی خان جیسے ماہرفن سے اکتساب کیا اور پھر انہوں نے وہی علم اور اس کی باریکیاں استاد بڑے غلام علی خان میں منتقل کیں۔ پھر خود استاد بڑے غلام علی خان نے اپنی محنت اور مثالی ریاض کے ذریعے فن کی مزید بلندیوں کو چھولیا۔ ان کا راگوں کو برتنے کا سلیقہ اور گائیکی کا انداز سامعین کو حیرت میں مبتلا کر دیتا تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ شاید یہ کسی بزرگ یا کرامت یا ان کے اپنے کشف وغیرہ کا حاصل ہے ..... حالانکہ ایسی کوئی بات نہیں تھی ..... یہ تو فن کے لئے اپنی زندگی وقف کر دینے ..... یا یوں کہیے کہ فن کے لئے فنا ہو جانے کے جذبے کا کمال تھا۔ ان کی شدید محنت نے انہیں فن کے بلند ترین درجات تک پہنچایا۔

سر اور راگوں پر استاد غلام علی خان صاحب کو اس درجہ عبور حاصل تھا کہ انسان تو کیا' چرند' پرند بھی کھنچے چلے آتے تھے۔ راگوں پر عبور کے ساتھ ساتھ شاید قدرت کی ودیعت کردہ خوبصورت' میٹھی اور سریلی آواز نے بھی خان صاحب کو یہ مافوق الفطرت سی طاقت عطا کر دی تھی کہ کئی مواقع پر بے زبان مخلوق بھی اس طاقت سے سحرزدہ ہو کر ان کی طرف کھنچی چلی آئی۔ اس قسم کے واقعات زیرنظر کتاب میں بھی آپ کے مطالعے میں آئیں گے۔ مثلاً ..... وہ واقعہ ..... کہ رات کے تین بجے خان صاحب ایک محفل میں گا رہے تھے۔ گانے کے بول تھے:

کوئلیا مت کر پکار.....

رات کے تین بجے اس گانے کے دوران میں نہ جانے کہاں سے ایک کوئل آ کر عین ان کے سامنے مائیکروفون پر بیٹھ گئی اور جب تک خان صاحب گاتے

Marfat.com

رہے وہیں بیٹھی رہی۔ گانا ختم ہونے کے بعد وہ اڑ گئی۔ محفل میں عام سامعین ہی نہیں' بڑے بڑے ماہرین بھی موجود تھے۔ انہیں بھی اس نظارے نے دم بہ خود کر دیا۔

میں اس خیال سے متفق ہوں کہ موسیقی' گائیکی اور اس طرح کے دوسرے فنون کی کوئی سرحد نہیں ہوتی۔ انہیں نہ تو سرحدوں میں قید کیا جا سکتا ہے کیونکہ یہ کسی کی ذاتی جاگیر یا جائیداد نہیں ہے۔ ہوا کے دوش پر بکھرنے کے بعد انہیں خود بہ خود آفاقیت حاصل ہو جاتی ہے یہ لامحدود چیزیں ہوتی ہیں۔ جس طرح ہوا پوری دنیا میں پھیلی ہوئی ہے اور اس پر کوئی ملکیت کا دعویٰ نہیں کر سکتا' بالکل اسی طرح موسیقی بھی کسی ایک خاص شخص کی نہیں' بلکہ بنی نوع انسان کی ملکیت ہے۔ اچھی آواز اور اچھی موسیقی دنیا کے کسی بھی گوشے سے ابھر سکتی ہے۔ اور دنیا کے کسی بھی کونے میں بیٹھے ہوئے فن شناس

Marfat.com

انسان کے کانوں میں رس گھول سکتی ہے۔ سائنسی ایجادات نے یہ کام اور بھی آسان بنا دیا ہے۔

استاد بڑے غلام علی خان صاحب کو اپنے عہد کے **"تان سین"** کا خطاب بھی دیا گیا۔ اس حوالے سے میں مختصراً اپنی ذاتی رائے کا اظہار بھی کرتا چلوں۔ بہت کم لوگوں نے شاید اس امر کی طرف توجہ دی ہو کہ تان سین دھرپد کے گائیک تھے۔ وہ زیادہ تر دھرپد ہی گاتے تھے جو کچھ زیادہ خوبصورت راگ نہیں۔ عموماً مندروں میں گایا جاتا ہے۔ تان سین کے بارے میں تاریخ میں ہمیں بہت کم مواد ملتا ہے ..... اور جو ملتا ہے' اس میں بھی ان کے فن کے بارے میں معلومات کم اور کچھ مافوق الفطرت سی باتوں کا تذکرہ زیادہ ہے۔ سب سے پہلے شہنشاہ اکبر کے وزیراعظم ابو الفضل نے دیوان اکبری میں تان سین کا تذکرہ کیا ہے۔ اس میں بھی ان کے فن کا تذکرہ تشنہ ہے۔

پاکستان میں سرکاری یا غیر سرکاری سطح پر استاد بڑے غلام علی خان صاحب کو کبھی خاطر خواہ اہمیت نہیں دی گئی جس پر مجھے بجا طور پر حیرت ہے۔ ان کے انتقال پر ہمارے صرف پیر علی محمد راشدی مرحوم نے ایک بڑے اور معروف روزنامے میں ان کا ذکر کیا مگر وہ بھی خاصے اختصار کے ساتھ۔ اس کی وجہ میری سمجھ میں یہی آئی ہے کہ استاد بڑے غلام علی خان صاحب' پنڈت نہرو کے بلاوے پر انڈیا چلے گئے تھے۔ پنڈت نہرو اس وقت ہندوستان کے وزیراعظم تھے اور انہوں نے خان صاحب کو شہرت دینے کا وعدہ کیا تھا۔ میں خان صاحب کو ان کے اس فیصلے پر کسی قسم کی ملامت کا مستحق ہرگز نہیں سمجھتا۔ پاکستان میں ان کے ساتھ ان کے شایانِ شان سلوک ہرگز نہیں ہو رہا تھا اور انہیں بجا طور پر یہ اندازہ بھی ہو چکا تھا کہ وہ اپنی موسیقی اور گائیکی کو جس مقام پر

Marfat.com

لے جانا چاہتے ہیں یا خود کو اس میدان میں جس مقام پر دیکھنا چاہتے ہیں' وہاں تک رسائی پاکستان میں ممکن نہیں ..... چنانچہ انہوں نے پنڈت نہرو کی پیشکش قبول کر لی اور انڈیا چلے گئے۔ پاکستان میں شاید ان کا یہ ''جرم'' کبھی معاف نہیں کیا گیا۔

بہرحال ..... اس میں شک نہیں کہ وہ ایک عظیم اور بے بدل فنکار تھے۔ جیسا کہ آپ زیرنظر کتاب میں بھی پڑھیں گے ..... وہ اتنے بڑے فنکار تھے کہ کوئی راگ گاتے وقت ایک سُر چھوڑ جاتے تھے تب بھی راگ میں کوئی فرق نہیں پڑتا تھا اور نہ ہی وہ اپنے مقام سے گرتا تھا۔ ان کی اس ادا کو دیگر کئی ماہرین فن نے اپنانے کی کوشش کی مگر وہ اس میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ اس سے خان صاحب کی عظمت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

خان صاحب کی عظمت اور انفرادیت میں تانوں کے استعمال کا بھی بڑا ہاتھ تھا۔ تانیں تین قسم کی ہوتی ہیں۔ پہلی تان ''پوٹھ'' کہلاتی ہے۔ دوسری ''النکار'' ہوتی ہے اور تیسری ''گمک'' تان کہلاتی ہے۔ بیشتر گویئے تانوں کا بے جا' بے محل اور بے ضرورت استعمال کرتے ہیں۔ خان صاحب صرف وہیں تان لگاتے تھے جہاں اس کی ضرورت ہوتی تھی۔ یہ بھی ان کی فن شناسی کی ایک دلیل تھی۔ النکار تان میں راگ کی بندش بھی استعمال کرنی پڑتی ہے۔ استاد بڑے غلام علی خان زیادہ تر ''گمک' تان لگاتے تھے۔ اسی طرح انہوں نے گانے میں زمزمہ لگانے کے بارے میں بھی کہا ہے کہ جو گویئے جو گانے کے شروع میں ہی زمزمہ لگاتے ہیں' اس سے راگ بگڑ جاتا ہے اور اس کا معیار گر جاتا ہے۔ زمزمہ اس وقت لگایا جاتا ہے جب گویا اپنے گانے کے نقطہ عروج پر ہو۔

اس کتاب میں خان صاحب کی گائیکی کی اثر آفرینی کے بارے میں جو

Marfat.com

حیرت انگیز واقعات بیان کیے گئے ہیں' ان کی صداقت میں کوئی شک و شبہ نہیں ہونا چاہیے۔ یہ واقعات ان کے انتہائی قریبی جاننے والوں نے بیان کیے ہیں جو خود بھی اپنی جگہ گائیکی اور موسیقی کے فن کے اساتذہ ہیں۔

یہاں میں یہ بھی عرض کرتا چلوں کہ استاد علی بخش' استاد کالے خان اور استاد بڑے غلام علی خان صاحب سے پہلے پنجاب میں ٹھمری گانے کا رواج نہیں تھا۔ پنجاب میں ٹھمری کو متعارف کرانے کا سہرا انہیں تین اصحاب کے سر ہے۔

استاد بڑے غلام علی خان صاحب کے پوتے رضا علی خان صاحب سے میری شناسائی ہے۔ میری دعوت پر وہ ایک مرتبہ پاکستان تشریف بھی لا چکے ہیں۔ کراچی میں میرے غریب خان پر منعقد ہونے والی ایک محفل میں ہم احباب ان کے موروثی فن سے محظوظ بھی ہوئے۔ میرے غریب خانے پر انہوں نے اپنی آواز کا جادو جگا کر مجھے عزت بخشی۔ اب درحقیقت وہی اپنے دادا کی آواز کے ورثے کے امین ہیں۔

پچھلے دنوں میرا ہندوستان جانا ہوا تو رضا علی خان صاحب کے علاوہ مالتی جیلانی صاحبہ سے بھی ان کے بنگلے پر ملاقات ہوئی ایک گھنٹے پر محیط رہی۔ مالتی جیلانی صاحبہ' استاد بڑے غلام علی خان صاحب کے خاص شاگردوں میں سے ایک ہیں۔ انہوں نے انگریزی میں اپنی تصنیف و تالیف کردہ یہ کتاب نہ صرف مجھے نہایت خلوص سے عنایت فرمائی بلکہ میری فرمائش پر اسے پاکستان میں اردو میں ترجمہ کرانے اور شائع کرنے کی بھی اجازت مرحمت فرمائی۔ رضا علی خان صاحب کی طرف سے بھی مجھے بہ صد خوشی یہ اجازت ملی جس پر میں تہ دل سے ان دونوں کا بے حد شکر گزار ہوں۔ پاکستان میں ان کے ساتھ محفلیں بھی رہیں جن میں رضا علی خان صاحب نے ہمارے اعزاز میں اپنے فن کا مظاہرہ کیا اور یوں ہمیں عزت بخشی۔ دو راتوں کے دوران' تین

Marfat.com

بجے تک یہ محفلیں جاری رہیں۔ رضا علی خان صاحب نے آغاز پوریا دھنا سری راگ سے کیا۔ بعد میں راگ ہمیر میں بھی گایا۔ استاد بڑے غلام علی خان صاحب کی گائی ہوئی کچھ ٹھمریاں بھی سنائیں اور پھر ہماری فرمائش پر ہمیں خالصتاً اپنی گائیکی سے بھی مخطوظ کیا۔ درحقیقت پاکستان میں استاد بڑے غلام علی خان صاحب کی ٹھمریوں اور خیال کی گائیکی کی یاد تازہ کرنے کے لے ہی درحقیقت ہم نے رضا علی خان صاحب کو پاکستان مدعو کیا تھا۔ انہوں نے موسیقی کی تعلیم اپنے والد استاد منور علی خان صاحب سے حاصل کی ہے۔ منور علی خان' ظاہر ہے' بچپن ہی سے استاد بڑے غلام علی خان کے زیر تربیت اور زیر نگرانی رہے ..... یوں بڑے خان صاحب کا فن نسل در نسل منتقل ہوا ہے۔ باپ' بیٹے ..... اور پھر پوتے کا بھی ماشااللہ وہی رنگ ہے۔ رضا علی خان صاحب نے بھی سُریلا گلا اور دل نشین آواز پائی ہے۔ جلد ہی میرا انہیں دوبارہ پاکستان مدعو کرنے کا ارادہ ہے۔ ایک اور معروف گانے والی خاتون پروین سلطانہ بھی شاید ان کے ساتھ تشریف لائیں۔ ویسے تو ان کا دعویٰ ہے کہ وہ استاد بڑے غلام علی خان ہی کی شاگرد ہیں لیکن ساتھ ہی ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ انہوں نے موسیقی کی تعلیم پنڈت چارانیہ سے بھی حاصل کی ہے۔ کسی راگ کو بگاڑے بغیر ایک سُر چھوڑ کر گانے کی کی کوشش پروین سلطانہ نے بھی کی ہے مگر وہ بھی اس میں کامیاب نہیں ہوسکیں۔ استاد بڑے غلام علی خان جیسی محنت کرنا اور ان جیسا مقام پانا ہر ایک کے نصیب میں کہاں ..... ایک بار پھر محترمہ مالتی جیلانی اور جناب رضا علی خان صاحب کے شکریے کے ساتھ میں آپ سے اجازت چاہوں گا۔

(طالب دعا .....نواب میر شفیع محمد خان جمالی)

Marfat.com

کچھ اس کتاب کے بارے میں

میرے ایک شناسا کی جناب ذیشان صاحب کے توسط سے نواب میر شفیع محمد خان جمالی صاحب سے ملاقات ہوئی۔ پرانے وقتوں میں تو نوابین' راجے مہاراجے اور بادشاہ وغیرہ ہی موسیقی اور دیگر فنون لطیفہ کے سب سے بڑے قدر دان اور سرپرست تھے لیکن وقت کے ساتھ ساتھ یہ روایتیں دم توڑ گئیں ہیں۔ اب نوابوں' سرداروں اور دوسرے صاحب ثروت افراد کے مشاغل' دلچسپیاں اور سرپرستی کے مراکز بدل گئے ہیں لیکن مجھے یہ جان کر ایک خوشگوار حیرت ہوئی کہ نواب میر شفیع محمد خان جمالی اس دور میں بھی ادب' آرٹ اور موسیقی سے گہرا شغف رکھتے ہیں۔ کلاسیکی موسیقی کے وہ زبردست رسیا اور استاد بڑے غلام علی خان صاحب کے بطور خاص' بہت بڑے مداح ہیں۔ ان کا آبائی تعلق بلوچستان کی سنگلاخ سرزمین سے ہے۔ اردو ان کی مادری زبان نہیں .....لیکن اردو سمیت کئی زبانوں سے قریبی آشنائی رکھتے ہیں۔ اس پس منظر کے ساتھ وہ کلاسیکی موسیقی کے اسرار و رموز اور باریکیوں سے بھی بخوبی واقف ہیں' یہ امر واقعی میرے لئے حیرت کا باعث تھا۔ ان کے پاس استاد بڑے غلام علی خان صاحب کی آڈیو اور وڈیوز کا ایسا مجموعہ موجود ہے جو کلاسیکل موسیقی سے شغف رکھنے والے ممتاز صاحبانِ ذوق کے پاس بھی مشکل ہی سے ہوگا۔

زیر نظر کتاب کا انگریزی ایڈیشن انہیں کیسے ملا' یہ قصہ آپ ان کے ''ابتدائیہ''

Marfat.com

میں پڑھ چکے ہیں۔ میرے لئے یہ ایک اعزاز تھا کہ اسے اردو میں ترجمہ کرنے کے لئے ان کی نگاہِ انتخاب مجھ پر پڑی۔ مجھے امید ہے کہ یہ کتاب کلاسیکی موسیقی سے گہری دلچسپی رکھنے والوں کے لئے ہی نہیں بلکہ مطالعے کا ذوق رکھنے والے عام قارئین کے لئے بھی دلچسپی کا باعث ہو گی کیونکہ اصل کتاب میں بھی کلاسیکی موسیقی کے بارے میں بات کرتے وقت زیادہ باریکیوں میں جانے اور خشک قسم کی بے جا طوالت اختیار کرنے سے گریز کیا گیا ہے اور ترجمہ کرتے وقت میں نے اس امر کا اور بھی زیادہ خیال رکھا ہے۔ یوں یہ کتاب درحقیقت موسیقی کے گنجلک مباحث کا مجموعہ نہیں بلکہ اپنے خاص میدانِ فن کے ایک بہت بڑے شہسوار کی داستانِ حیات ہے۔ ایک جینئیس' ایک نابغہء روزگار' ایک غیر معمولی فنکار اور ایک LEGEND کی زندگی کی کہانی ہے ..... جو یہ سب کچھ ہونے کے باوجود ہماری اور آپ کی طرح ایک عام آدمی بھی تھا۔ ہماری آپ کی طرح اس کی زندگی میں بھی جدوجہد کی صعوبتیں' کامیابیوں کی راحت' چھوٹی بڑی خوشیاں' اور چھوٹے بڑے دکھ تھے۔ ہر بڑے آدمی کی داستانِ حیات میں سیکھنے والی بہت سی باتیں ہوتی ہیں۔ آپ چاہیں گے تو خان صاحب کی داستانِ حیات میں بھی وہ باتیں تلاش کر سکیں گے۔ مالتی جیلانی صاحبہ نے بھی اصل کتاب میں ان کی زندگی کی کہانی کو بڑے سادہ' دل نشین اور عام فہم پیرائے میں بیان کیا ہے اور میں نے ترجمے میں اس وصف کو مزید اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ یوں کوئی بھی شخص اس کتاب کے مطالعے کو ایک بور کام قرار دیے بغیر اس سے بہت کچھ اخذ کر سکتا ہے اور محظوظ بھی ہو سکتا ہے۔ اس کے فکر و خیال کو نئی راہیں مل سکتی ہیں۔

اس کے ساتھ ساتھ میں یہ وضاحت بھی کرتا چلوں تو مناسب ہو گا کہ یہ تجارتی مقاصد یا مالی منفعت کے لئے شائع کی جانے والی کتاب نہیں ہے۔ یہ تو محض اپنے دور کے ایک بڑے فنکار کی خدمت میں اس کے مداح کا نذرانہ عقیدت ہے۔

Marfat.com

اس قسم کے موضوعات پر چھپنے والی کتابوں میں آج کل ویسے بھی مالی منفعت کہاں ..... یہ تو سراسر خسارے کا سودا ہے ..... لیکن بس ..... کوئی نہ کوئی اہلِ ذوق، دیگر صاحبانِ ذوق کے لئے اس طرح کے خسارے کے سودے کرتا ہی رہتا ہے۔ اس طرح اس نفسا نفسی اور مارا ماری کے دور میں، کسی نہ کسی دور افتادہ گوشے میں فنونِ لطیفہ کے قدردانوں کی کاوشوں کے چراغ بھی جیسے تیسے، یکے بعد دیگرے روشن ہوتے ہی رہتے ہیں اور بے پناہ مادیت پرستی اور ذہنی جہالت کے اندھیروں میں شعور اور بے غرضی کی تھوڑی بہت روشنی پھلانے کی اپنی سی کوششیں کرتے رہتے ہیں۔ نفیس روایتوں اور قدیم تہذیبی قدروں کو زندہ رکھنے کے یہی طریقے ہیں۔ جس روز اس طرح کی کاوشیں بالکل ہی ترک کر دی جائیں گی، اس روز گہری اور مکمل تاریکی چھا جائے گی۔ جس میں ہم حرص اور ہوس کے ہتھیار سنبھالے ایک دوسرے کی گھات میں رہنے کے سوا کچھ بھی نہیں کریں گے۔

تحریر میں خامیاں نظر آئیں ..... کوئی بات کسی کی طبعِ نازک پہ گراں گزرے..... یا کسی نکتے سے کسی صاحب رائے کو اختلاف ہو تو اس کے لئے پیشگی معذرت ..... اور ہر صاحب علم کا نکتہ نظر سر آنکھوں پر ..... بس، دعاؤں میں یاد رکھئے گا۔

(محمود احمد مودی)

Marfat.com

تعارف

☆مالتی جیلانی

مجھے گانے کا اس وقت سے ہی بڑا شوق تھا جب میں چھوٹی تھی۔ موسیقی کا کچھ شعور آنے کے بعد میری دلی خواہش تھی کہ میں کسی بڑے' نامور اور ماہرفن استاد سے موسیقی کی تعلیم اور تربیت حاصل کرسکوں۔ میری خوش قسمتی تھی کہ وہ ہستی مجھے استاد بڑے غلام علی خاں صاحب کی صورت میں مل گئی۔ نومبر 1963ء میں جب میری ان سے ملاقات ہوئی اس وقت تک وہ اپنے میدان میں ایک بے مثال اور نابغہء روزگار شخصیت بن چکے تھے۔ بلا مبالغہ موسیقی کے میدان میں ان کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ 63ء میں کلکتہ میں میری ان سے ملاقات اپنی ایک دوست کے ہاں ہوئی تھی' جس نے ایک محفل موسیقی کا اہتمام کیا تھا جس میں استاد بڑے غلام علی خان صاحب گانے کے لئے تشریف لا رہے تھے۔ اس دن سے لے کر ان کے انتقال تک میرا ان سے استاد شاگرد کے رشتے کے علاوہ ایک گہرا روحانی اور ذہنی تعلق بھی رہا۔ میں نے ان سے صرف موسیقی کے نشیب وفراز کے بارے میں ہی نہیں' بلکہ زندگی کے عمومی رویوں کے بارے میں بھی بہت کچھ سیکھا۔ میں نے پوری کوشش کی ہے کہ وہ سب کچھ اس کتاب میں منتقل کرسکوں۔ استاد مجھ سے ہمیشہ پنجابی میں بات کرتے تھے۔ ان کی باتوں کو ان کے صحیح' مفہوم' معانی اور روح کے ساتھ انگریزی میں منتقل کرنا میرے لیے خاصا مشکل

Marfat.com

کام ثابت ہوا۔

میرا تعلق ایک ایسی فیملی سے ہے جس میں زیادہ تعداد میڈیکل ڈاکٹرز کی رہی ہے۔ پھر کچھ لوگوں نے تعلیم کے شعبے میں نمایاں مقام حاصل کیا۔ ابتدائی طور پر ہمارا خاندان پنجاب میں رہا۔ میرے خاندان کے افراد کو طب اور تعلیم کے ساتھ ساتھ فنون لطیفہ سے بھی گہری دلچسپی رہی۔ میرے والد لیفٹیننٹ جنرل شیو پرشاد بھاٹیہ' جو آرمی میڈیکل کور سے وابستہ تھے' موسیقی کے نہایت دلدادہ ..... اور خاص طور پر گانے کے شوقین تھے۔ گائیکی کا شوق میری والدہ سمترا بھاٹیہ کو بھی تھا جن کا تعلق راولپنڈی سے تھا۔

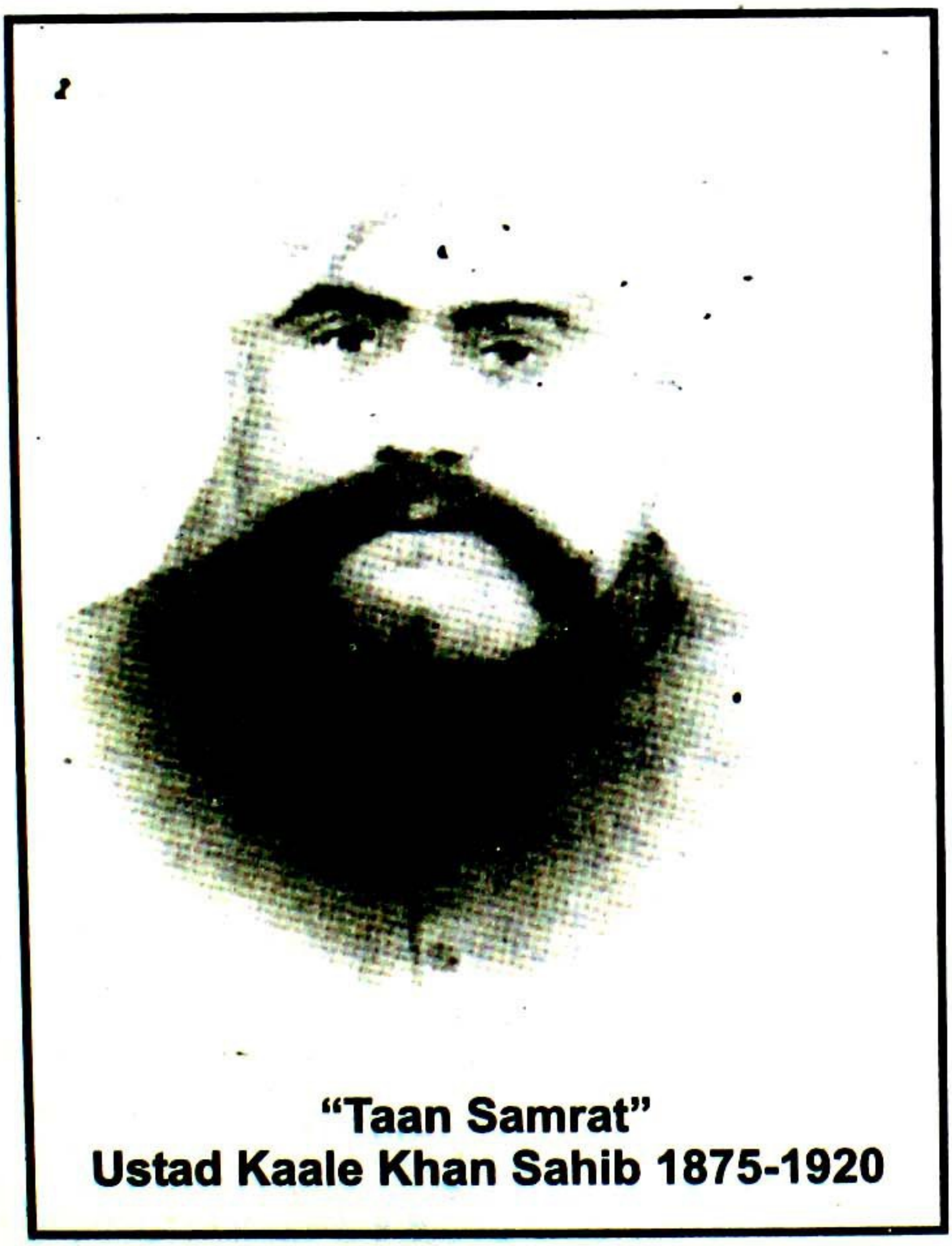

"Taan Samrat"
Ustad Kaale Khan Sahib 1875-1920

Marfat.com

میرے نانا رام دتہ مَل بھاٹیہ ایک نہایت وسیع الذہن' بالغ نظر اور بلند انداز فکر رکھنے والے آدمی تھے۔ وہ ڈی۔ اے۔وی کالج راولپنڈی کے بانی پرنسپل تھے۔ انہوں نے راولپنڈی میں آریہ ہاسپٹل کی بھی بنیاد رکھی۔ وہ فارسی کے استاد تھے۔ فارسی کے پروفیسر کی حیثیت سے ان کی خدمات ایک الگ موضوع ہے۔ وہ کٹر قوم پرست اور وطن پرست تھے۔ زندگی بھر کھڈی کا بنا ہوا کپڑا پہنتے رہے۔ وہ پنجاب میں آریہ سماج تحریک کے عہدے دار بھی تھے۔ وہ قدیم ہندوستانی ثقافت کے احیاء اور اس کی ترویج کے بہت بڑے حامی تھے ..... اور شاستر یہ سنگیت بہرحال اس ثقافت کا اہم حصہ ہے۔ میرے دادا ہیرا لال بھاٹیہ پنجاب میں ابتدائی دور کے ڈاکٹرز اور سرجنز میں سے ایک تھے۔ انہوں نے 1896ء میں میو میڈیکل کالج سے میڈیکل کی تعلیم حاصل کی تھی۔ میرے والد بھی ڈاکٹر ہی تھے۔ انہوں نے گرانٹ میڈیکل کالج' بمبئی سے میڈیکل کی تعلیم حاصل کی اور 1926ء میں آرمی میڈیکل سروس جوائن کی۔ انیس سال کی عمر میں میری والدہ کی شادی میرے والد سے ہوئی۔ ان کی ظاہری شخصیت' انداز اور رہن سہن جدید طرز زندگی کی عکاسی کرتا تھا۔ وہ عورتوں کی اعلیٰ تعلیم اور مناسب آزادی کی قائل تھیں۔ ان کی اپنی بہنیں اعلیٰ تعلیم یافتہ اور زندگی کے مختلف شعبوں میں ممتاز مقام رکھتی تھیں۔

ہم تین بہن بھائی ہیں۔ میرے بھائی کا نام اشوک اور بہن کا نام اندرا ہے۔ ہمارا بچپن مختلف کینٹونمنٹس میں پرمسرت انداز میں گزرا۔ والد صاحب کا جہاں بھی تبادلہ ہو جاتا' ہمیں بھی وہیں جانا پڑتا۔ میرے بچپن کی یادوں میں مردان اور پشاور کے زمانے کی یادیں بھی شامل ہیں۔ مجھے اپنے والدین کے حلقہ احباب

Marfat.com

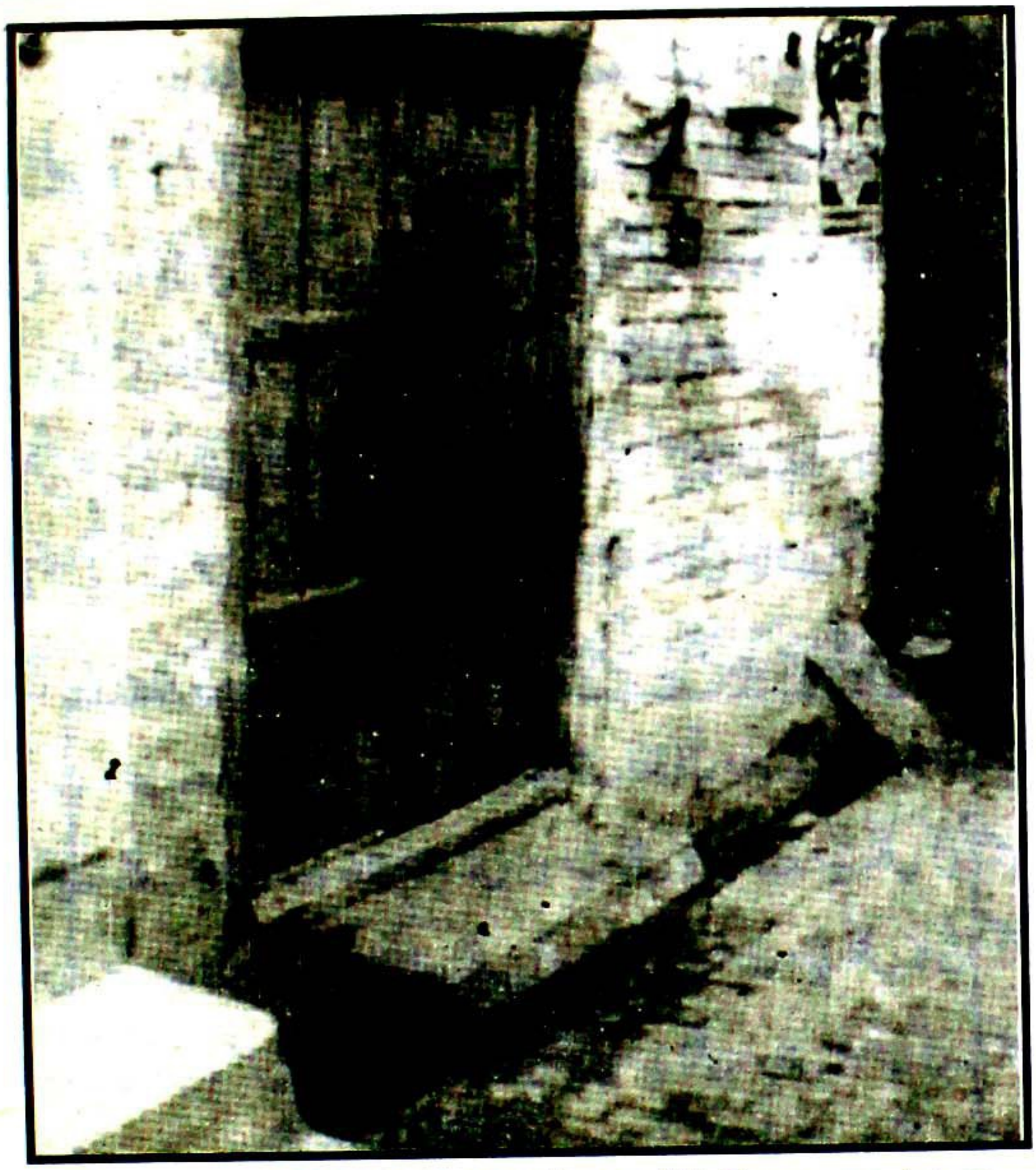

Doorway of the house where Ali Bux was born

میں سے بھی بہت سے لوگوں کے بارے میں بہت سی باتیں یاد ہیں۔ ہم سب ایک ہی زبان میں باتیں کیا کرتے تھے اور ہمارا کلچر بھی ایک ہی تھا۔ ہمارے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ ایک روز بہت بڑی خون ریزی اپنے دامن میں لیے ایک تقسیم عمل میں آئے گی جو صدیوں کے رشتے اور ثقافتی ناتے توڑ دے گی۔ تقسیم ہند کے وقت میرے والد دہلی میں آرمی ہیڈ کوارٹرز میں تعینات تھے۔ ہم بچے کا نونٹ آف جیسس اینڈ میری سکول میں پڑھنے جاتے تھے۔ ہماری باقی فیملی اس وقت راولپنڈی اور لاہور میں رہ رہی تھی۔ مہاتما گاندھی تو زور دے رہے تھے کہ جس کا جہاں گھر ہے وہ وہیں رہے

Marfat.com

لیکن نو تشکیل شدہ ہندوستان پاکستان کی سرحد کے دونوں طرف خونریز فسادات پھوٹ پڑے تھے اور جہاں جس کی اکثریت تھی وہ اقلیت کو قتل کر رہا تھا۔ تقسیم کا عمل ہم سب کے لئے بہت بڑی ذہنی اذیت اور ایک ایسا تجربہ تھا جس کے نقوش ذہنوں سے کبھی مٹ نہیں سکیں گے ..... گو کہ ہمیں ان اذیتوں سے نہیں گزرنا پڑا جن سے لاکھوں لوگ گزرے۔ میرے والد کو ایک طیارہ چارٹر کر کے راولپنڈی جانا پڑا۔ وہ خاندان کے افراد کو دہلی لائے جہاں سے ان میں سے بیشتر امرتسر جا کر آباد ہو گئے اور انہیں دوبارہ اپنے آبائی گھر دیکھنے نصیب نہیں ہوئے جو پاکستان میں رہ گئے تھے۔ لاہور میں میرے والد کی فیملی نسبت روڈ پر رہ رہی تھی جہاں میرے دادا ڈاکٹر ہیرا لال کا کلینک بھی تھا جو ان کے انتقال کے بعد لاہور مونیسٹری سکول کو کرائے پر دے دیا گیا تھا۔ نئی دہلی میں میرا کانونٹ سکول کا زمانہ 42ء سے 47ء تک کے عرصے پر محیط ہے۔ اس تمام عرصے کے دوران میں ہمیں میوزک کا ایک ٹیچر اور ہندی پڑھانے کے لئے ایک ٹیوٹر میسر رہا۔ دس سال کی عمر سے میں نے گھر پر کلاسیکل گانا سیکھنا شروع کر دیا تھا۔ میرے استاد ایک شائستہ قسم کے بنگالی تھے جن کا نام خستگیر تھا۔ پرانی دہلی کے کئی محلوں میں موسیقی کے اساتذہ اور گھرانے اپنے روایتی انداز میں رہ رہے تھے لیکن تقسیم ہند کے وقت ان میں سے بہت سے پاکستان ہجرت کر گئے جن میں مشہور سارنگی نواز بندو علی خان صاحب بھی شامل تھے۔ تقسیم سے پہلے موسیقاروں اور گائیکوں میں سے بہت سے آل انڈیا ریڈیو پر اپنے فن کا مظاہر کرتے تھے اور نجی طور پر منعقد ہونے والی' موسیقی کی محفلوں میں شرکت کرتے تھے۔ تقسیم کے بعد باقی رہ جانے والوں نے بھی یہ سلسلہ جاری رکھا۔ یہ دہلی کے قدیم گھرانے تھے۔ ان دنوں میری خواہش تھی کہ میں ان اساتذہ میں سے کسی سے کچھ سیکھ سکوں لیکن بوجوہ یہ ممکن نہ ہو سکا۔ سینئر کیمبرج پاس کرنے کے بعد میں نے دہلی یونیورسٹی کے مرنڈا ہاؤس میں داخلہ لے لیا۔ اس کے

Marfat.com

ساتھ ساتھ میں نے اپنی موسیقی کی تعلیم جاری رکھنے کے لئے ''گندھاروا مہاوِدیالہ'' میں داخلہ لے رکھا تھا جو ایک طرح کا میوزک سکول تھا۔ اس زمانے میں وہ کناٹ پیلس پر' اوڈین سینما کے اوپر ایک اپارٹمنٹ میں قائم تھا۔ وہاں میرے ٹیچر شری ونود کمار تھے جو استاد بڑے غلام علی خان کے بہت بڑے مداح اور پرستار تھے جو ان دنوں پنجاب کے اس حصے میں واقع ایک چھوٹے سے شہر قصور میں رہ رہے تھے جو اب پاکستان میں شامل تھا۔ میں نے استاد بڑے غلام علی خان صاحب کے ابتدائی زمانے کے کچھ گراموفون ریکارڈ سن رکھے تھے۔ ونود کمار جی نہایت عقیدت بھرے انداز میں ان کے بارے میں باتیں کرتے تھے۔ گوکہ انہوں نے خان صاحب سے کچھ نہیں سیکھا تھا..... یعنی انہیں ذاتی طور پر ان کی خدمت میں حاضر ہو کر ان کے فن سے استفادہ کرنے کا موقع نہیں ملا تھا لیکن وہ اپنے آپ کو ان کا روحانی شاگرد سمجھتے تھے اور ان کی گائیکی کا انداز اپنانے کی کوشش کرتے تھے۔

میں جب مرنڈا ہاؤس سے اکنامکس میں بی اے آنرز کر رہی تھی تو میرے والدین کا خیال تھا کہ میں آگے چل کر ہندوستان کی قومی سیاست میں حصہ لوں اور میڈم وجے لکشمی پنڈت ٹائپ کی شخصیت بن جاؤں لیکن رفتہ رفتہ انہیں یہ دیکھ کر مایوسی ہونے لگی کہ میری دلچسپی تو راگ اور راگنیوں سے آگے ہی نہیں بڑھتی تھی۔

میں جب دہلی میں انگلش لٹریچر میں ایم اے کر رہی تھی تو میں نے فیصلہ کیا کہ مجھے شانتی نکیتن' بنگال جا کر کالا بھون میں داخلہ لینا چاہیے۔ ستمبر 1953ء میں میں نے اپنے اس ارادے پر عمل کر ڈالا۔ میرے لیے وہ روز بڑا ہیجان خیز تھا۔ میں بنگالی موسیقی کی نغمگی اور وہاں کے کلچر کی گہرائی میں اترنے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہاں کی فضا میں گرودیو رابندر ناتھ ٹیگور کے اثرات بھی موجود تھے۔ ان کا گھر' ان کا باغ' اور

111087

Marfat.com

ان کی پینٹنگز وغیرہ محفوظ تھیں اور ان کے گانے وہاں صبح شام گائے جاتے تھے۔ یہ سب چیزیں ان کی تخلیقی صلاحیتوں، فلسفے اور طرز زندگی کی یاد دلاتی تھیں۔

Ustad Ali Bux Khan - Father of Bade Ghulam Ali Khan, 1871-1940

شانتی نکیتن میں بہت سے غیر بنگالی شاگرد موجود تھے۔ ماحول نہایت غیر روایتی، فطری اور رومانوی تھا۔ کلاسیں درختوں کے نیچے ہوتی تھیں۔ طالبات کھلے بالوں کے ساتھ، خوبصورت نظاروں کے درمیان، جہاں جی چاہے، گھومتی پھرتی تھیں۔ وہاں رسمی اور روایتی قاعدے قانون اور ضابطے نہیں تھے۔ طلباء ننگے پاؤں گھاس پر پھرتے۔

Marfat.com

کیمپس میں جدھر دل چاہتا نکل جاتے۔ جھیل میں اتر جاتے۔ ہم نتھالی لڑکیوں کی طرح گیت گاتے اور پھول چنتے۔ اس دیہی علاقے سے بہت سے سنت' سادھو' درویش اور فقیر بھی مخصوص انداز میں گاتے ہوئے گزرتے۔ ان کا گانے کا انداز بنگالی کلچر کا ایک حصہ تھا۔ ان میں سے بہت سے مسلمان بھی ہوتے تھے۔ بنگالی کا وہ حصہ جو اب بنگلہ دیش کہلاتا ہے' وہاں شہرت پانے والے بہت سے گائیکوں کے فن کی بنیاد انہی سادھوؤں' درویشوں اور فقیروں کے گانے کا انداز تھا۔ اس خطے میں نام پیدا کرنے والے گائیکوں میں عباس الدین احمد' افسری بیگم' لیلیٰ انجمن بانو وغیرہ شامل ہیں۔

بنگال کے اس حصے کی ثقافتی بنیادیں ہندوستان سے بھی ملتی ہیں۔ ٹیگور کو وہاں قومی شاعر کا درجہ حاصل ہے۔ میں نے اس زمانے میں ہر مسلمان بنگالی کے گھر میں محمد علی جناح کی پورٹریٹ کے ساتھ ساتھ ٹیگور کی تصویر ضرور آویزاں دیکھی۔ میں نے وہاں کافی دنوں تک موسیقی اور مصوری کی تعلیم حاصل کی لیکن پھر میں نے محسوس کیا کہ وہاں سارا زور صرف ٹیگور کے سنگیت پر ہے چنانچہ میں 1954ء میں دہلی لوٹ آئی۔

اس زمانے میں دہلی میں میری ملاقات اسلم جیلانی سے ہوئی جن سے بعد میں میری شادی ہوئی۔ وہ ان دنوں ایک برٹش فرم "بامر لاری اینڈ کمپنی" میں بزنس ایگزیکٹو تھے۔ کاروبار کے ساتھ ساتھ انہیں فنون لطیفہ سے بھی گہری دلچسپی تھی۔ 1954ء میں ہماری شادی ہو گئی اور 1956ء میں ان کا تبادلہ کلکتہ ہو گیا اور یوں میں ایک بار پھر بنگال پہنچ گئی۔ میں نے وہاں کلاسیکل موسیقی اور گانا سیکھنے کا سلسلہ جاری رکھا اور یہ میری خوش قسمتی تھی کہ چند سال بعد وہیں میری ملاقات استاد بڑے غلام علی خان صاحب سے ہو گئی۔ میری ایک دوست ایتامتر نے پارک مینشن میں میں ستیہ ناتھ

Marfat.com

صاحب کے گھر پر ایک محفل موسیقی کا اہتمام کیا تھا۔ ستیہ ناتھ صاحب' جنہیں مختصراً ''ساتھ'' صاحب کہا جاتا تھا' استاد بڑے غلام علی خان صاحب کے زبردست مداح تھے۔ مجھے یاد ہے' اس شام خان صاحب نے گانے کا آغاز راگ ملتانی سے کیا تھا۔ شاید اس لئے کہ وہ سہ پہر کا وقت تھا اور وقت کی مناسبت سے راگ ملتانی موزوں تھا بعد میں خان صاحب نے وضاحت سے ہمارے اس خیال کی تصدیق کی کہ راگ ملتانی' شام کے بڑھتے سایوں کی عکاسی کرتا ہے۔

کمرہ موسیقی کے شائقین سے بھرا ہوا تھا۔ اگلی صف میں اپنی بہن اندرا اور اپنی دوست عالیہ لطیف کے ساتھ بیٹھی تھی۔ جب خان صاحب راگ کو ولمبت میں گا چکے تو پھر انہوں نے ایک ٹکڑا تیز رفتار درُت میں گایا۔ شاید میری محویت اور میرے تاثرات کی وجہ سے خان صاحب بار بار میری طرف دیکھ رہے تھے۔ آخر چائے کے لئے وقفہ ہوا تو انہوں نے اشارے سے مجھے قریب بلایا۔ میں نے جا کر ان کے پاؤں چھوئے۔ انہوں نے پنجابی میں پوچھا ''پتر! کج گانا وجانا آندا اے؟'' (بیٹا کچھ گانا بجانا آتا ہے؟)

میں نے ہچکچاتے ہوئے جواب دیا ''جی ہاں .....تھوڑا بہت آتا ہے۔ اور مزید سیکھنا چاہتی ہوں۔''

میں نے یہ جواب پنجابی میں دیا تھا۔ اسی دوران میں ان کے بڑے صاحبزادے منور علی خان صاحب کمرے میں داخل ہوئے۔ خان صاحب نے بچوں کی طرح خوش ہوتے ہوئے انہیں مخاطب کر کے پنجابی میں کہا ''مینو یار! یہ لڑکیاں پنجاب کی ہیں''۔

پھر انہوں نے دوسرے روز ہمیں اپنے گھر آنے کی دعوت دی۔

Marfat.com

.....☆.....

استاد بڑے غلام علی خان صاحب کے استاد یا گرؤ ان کے چچا استاد کالے خان تھے جو قصور میں رہتے تھے۔ انہوں نے موسیقی کی تربیت پٹیالہ گھرانے کے استاد فتح علی خان صاحب سے لی تھی۔ استاد کالے خان صاحب ظاہری طور پر بھی ایک زبردست اور بارعب شخصیت کے مالک تھے لیکن اکثر اوقات کھوئے کھوئے اور گردوپیش سے بیگانہ نظر آتے تھے۔ ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ایک بار وہ اپنے استاد فتح علی خان صاحب کے سامنے گاتے گاتے بے خیالی میں' اپنی دھن میں اور موسیقی کے بہاؤ میں استاد سے مقابلہ کرنے لگے جس پر استاد نے خفا ہو کر انہیں ڈانٹا اور کہا" جا ..... دفع ہو جا پاگل کہیں کے .....!" کالے خاں چونک کر گویا ہوش وحواس کی دنیا میں واپس آئے اور شرمندگی سے باہر بھاگ گئے۔ اس دن سے انہیں گویا چپ لگ گئی۔ رفتہ رفتہ لوگوں نے انہیں "مست" کہنا شروع کر دیا جو عام طور پر مجذوب کو کہا جاتا ہے لیکن وہ بہرحال مجذوب نہیں تھے۔ ہندوستان بھر میں وہ محفلوں میں گانے کے لئے جاتے تھے۔ ان کی آواز میں شیر کی سی گمن گرج تھی اور سننے میں آتا ہے کہ جب وہ گاتے تھے تو بسا اوقات کھڑکیوں کے شیشے ٹوٹ جاتے تھے۔ وہ باڈی بلڈر بھی تھے اور اپنی جسمانی ساخت سے گویے سے زیادہ پہلوان دکھائی دیتے تھے۔ ایک بار وہ گانے کے لئے لکھنؤ گئے تو انہیں نذرانے کی طور پر خاصی رقوم ملیں۔ وہ دریائے گومتی پر پہنچے اور پچاس روپے دریا میں پھینک دیئے۔ پچاس روپے اس زمانے میں بہت بڑی رقم تھی۔ یہ رقم دریا میں پھینک کر وہ بولے "یا خضر علیہ السلام! میرا نذرانہ قبول فرمایئے"۔

Marfat.com

پھر وہ اس زمانے کی عطریات اور خوشبو کی مشہور ترین دکان ''اصغر علی' محمد علی'' پر پہنچے اور بہت سے عطر خرید لیے۔ کچھ عطر انہوں نے اپنے کپڑوں پر چھڑکا لیکن زیادہ مقدار اپنی مونچھوں پر چھڑک لی۔ کسی نے پوچھا کہ انہوں نے ایسا کیوں کیا .....؟ تو بولے ''بھئی ..... جب میں مروں گا تو میرے کپڑے تو دنیا میں ہی رہ جائیں گے لیکن میری مونچھیں ساتھ جائیں گی۔''

بڑے غلام علی خان صاحب کے والد کا نام علی بخش خان تھا۔ وہ کالے خان صاحب کے بڑے بھائی تھے۔ وہ خیال' ترانہ اور ٹھمری کے بہت بڑے گویئے تھے لیکن ایک بار وہ کالے خان صاحب کے ساتھ گانے بیٹھے تو ان کا مقابلہ نہ کر سکے جن پر انہوں نے اتنی شرمندگی محسوس کی کہ گھر ہی چھوڑ کر چلے گئے۔ وہ کلکتہ جا پہنچے جہاں ان کی ملاقات گوہر جان سے ہوئی جس نے انہیں مہندر ناتھ سے ملوایا جو اپنے وقت کے بہت بڑے گویے تھے۔

گوہر جان اسٹیج کی بہت بڑی اداکارہ تھی جو ایشیا اور یورپ کی سات زبانوں میں گا بھی سکتی تھی۔ وہ ہندوستان کی ایک نہایت مشہور شخصیت تھی۔ اسے غیر رسمی طور پر "DAME MELBA OF INDIA" کا خطاب ملا ہوا تھا۔ وہ بڑی شان و شوکت اور طمطراق سے رہتی تھی۔ چار گھوڑوں کی خوبصورت اور شاہانہ انداز کی بگھی میں سفر کرتی تھی۔ جو اس زمانے میں ایسا ہی تھا جیسے آج کل رولز رائس میں سفر کرنا کہا جاتا ہے کہ ایک بار گوہر جان اپنی بگھی میں کلکتہ کے اس علاقے سے گزر رہی تھی جسے میدان کہا جاتا تھا۔ اسی دوران وائسرائے آف انڈیا کا بھی اپنی بگھی میں وہاں سے گزر ہوا۔ وہ گوہد جان کا انداز' اس کی شخصیت' اس کی تمکنت اور اس کی شاہانہ بگھی دیکھ کر سمجھا کہ

Marfat.com

کوئی مہارانی سیر کو نکلی ہے۔ اس نے بگھی میں کھڑا ہو کر' ہیٹ اتار کر گوہر جان کو سلام کیا۔

بعد میں جب اسے گوہر جان کے بارے میں حقیقت بتائی گئی تو اسے بہت غصہ آیا اور اس نے حکم جاری کیا کہ آئندہ کوئی ہندوستانی اس قسم کی شاہانہ بگھی میں میدان کے علاقے میں نہ گھومے۔ گوہر جان احتجاج کے طور پر اس کے بعد گھر سے ہی نہیں نکلی۔ وہ اپنی ہم پیشہ اور ہم عصر دوسری عورتوں سے بہت مختلف تھی۔اس کے انداز و اطوار میں بڑا سلیقہ' رکھ رکھاؤ اور تمکنت تھی۔ وہ بڑی وطن پرست اور قوم پرست تھی۔ اس میں اپنے ذاتی وقار کے تحفظ اور اپنے حقوق کے لئے لڑنے کا جذبہ بھی تھا۔ وائسرائے آف انڈیا کے حکم کے خلاف اپیل کرنے وہ انگلینڈ چلی گئی اور اس نے اپنا کیس ملکہ وکٹوریہ کے سامنے پیش کیا۔ اس نے ملکہ وکٹوریہ سے پوچھا کہ آخر وہ کیوں اپنی چار گھوڑوں کی بگھی میں اپنے وطن کی سڑکوں پر نہیں نکل سکتی؟ ملکہ وکٹوریہ کو اس کے موقف کا قائل ہونا پڑا اور وہ اپنا کیس جیت کر واپس آئی۔

کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ گوہر جان کی ماں بنگالی اور باپ سفید فام روسی تھا جبکہ بعض لوگ اس کی ماں یا باپ کے یہودی ہونے کا دعویٰ بھی کرتے ہیں۔ اس کے بارے میں یہ بھی مشہور ہے کہ وہ اس قدر دولت مند تھی کہ اس کی ملازمہ تک کی جوتیوں میں ہیرے جڑے ہوتے تھے۔ لیکن اس کی داستان حیات نہایت عبرت آموز ہے۔ سنا ہے وہ چنی لال نامی ایک نوجوان کے عشق میں ایسی پاگل ہوئی کہ سب کچھ لٹا بیٹھی اور مفلسی کی موت مری۔ اپنے زمانے کی مشہور فلم اسٹار نرگس کی ماں جدّن بائی کی پرورش اور تربیت بھی گوہر جان نے کی تھی اور اسے ایک کامیاب گلوکارہ بنایا تھا۔ گوہر جان کا

Marfat.com

انتقال غالباً 1931ء میں ہوا اور یوں ہندوستانی شو بزنس کی تاریخ کا یہ ابتدائی اور روشن باب بند ہو گیا۔

بڑے غلام علی خان' خدا بخش خان کے سب سے بڑے صاحبزادے تھے۔ ان کی تربیت باپ اور چچا' دونوں ہی نے کی۔ چنانچہ جب بڑے غلام علی خان صاحب تان لگاتے تھے تو ان میں کالے خان صاحب کا انداز جھلکتا تھا اور جب وہ سرگم پر آتے تھے تو ان کے انداز سے والد کی جھلک محسوس ہوتی تھی۔ ان کی آواز بے پناہ طاقت رکھنے کے ساتھ ساتھ نہایت سریلی اور رسیلی بھی تھی۔ انہوں نے جب پنڈت نہرو کے سامنے گایا تو انہوں نے بھی بعد میں ان کے نام ایک تعریفی پوسٹ کارڈ لکھا تھا۔ انہوں نے اپنی زیادہ تربیت استاد کالے خان صاحب سے ہی حاصل کی۔ اس لئے صحیح معنوں میں وہی ان کے استاد ہیں۔ استاد کالے خان کی گائیکی پر دھر پد گھرانے کے اثرات بھی تھے۔ وہ استاد اللہ بندے خان سے متاثر تھے۔ اس سے استاد بڑے غلام علی خان صاحب کو یہ فائدہ ہوا کہ ان کی گائیکی میں کئی بڑے اساتذہ کے رنگوں کی آمیزش ہو گئی۔ اس میں قصور اور پٹیالہ گھرانوں کا رنگ بھی تھا۔ ایران اور عرب کی موسیقی سے بھی وہ استفادہ کرتے محسوس ہوتے تھے اور پنجاب کی لوک موسیقی کی دلکشی کو بھی وہ اپنی گائیکی میں سمو لیتے تھے۔ شاید اسی لئے انہوں نے فن کی دنیا میں اپنا تخلص ''سب رنگ'' رکھا ہوا تھا۔ شاید انہی کی وجہ سے پنجاب سے یہ کہاوت چلی کہ ''قصور کی مٹی سریلی اور میتھی خوشبو دار ہے۔''

.....☆.....

Marfat.com

ابتدائیہ:

سُر کی دیوی کی تلاش

پاکستانی پنجاب کے شہر لاہور سے کچھ فاصلے پر ''قصور'' نام کا ایک شہر پرانے وقتوں سے آباد ہے۔ روایت کچھ یوں ہے کہ اس شہر کا ایک باسی ایک بار ''سُر کی دیوی'' کی تلاش مین نکل کھڑا ہوا۔ اس نے سنا تھا کہ سُر کی دیوی جنگلوں' پہاڑوں' دریاؤں یا میدانوں میں کہیں بھی اچانک مل سکتی ہے۔ اس کے دل میں سر کی دیوی کی تلاش کرنے اور اسے دیکھنے کی خواہش اور اشتیاق اتنا شدید تھا کہ کوئی واضح منزل سامنے نہ ہوتے ہوئے بھی اس نے اپنا گھر بار اور شہر چھوڑا اور سفر پر نکل کھڑا ہوا۔

برسوں اس نے برف پوش پہاڑوں' گھنے جنگلوں اور ویرانوں میں دشوار گزار راستوں پر سفر کیا۔ دریاؤں اور پہاڑی ندی نالوں سے گزرا۔ طویل اور پُرصعوبت سفر نے اس کی حالت بگاڑ دی۔ سر اور داڑھی کے بال جھاڑ جھنکاڑ کی طرح بڑھ گئے۔ موسم کی سختیوں کے باعث کھال بھی کھردری ہوگئی اور چیخ گئی۔ آنکھوں میں کسی بھٹکے ہوئے جانور کی سی وحشت اتر آئی۔ اس کے پاؤں اکثر زخمی ہی رہتے۔ اسی حالت میں وہ بوڑھا ہوگیا۔ سُر کی دیوی اسے کہیں نہ ملی ..... لیکن اس کے دماغ میں جو سودا سمایا

Marfat.com

ہوا تھا' اس کے سر پر جو دھن سوار تھی' وہ برقرار رہی۔ اپنی تلاش ترک کرنے اور گھر واپس جانے پر اس کا دل آمادہ نہ ہوا۔

ایک روز وہ تھک ہار کر قدرے مایوسی اور دل شکستگی کے عالم میں ذرا ستانے کے لئے ایک چٹان سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر کے بیٹھا تو اچانک ایک آواز گونجی ''فضل داد! میں یہاں ہوں .....''

فضل داد نے آنکھیں کھولی کر ادھر ادھر دیکھا تو اسے یوں لگا جیسے کچھ دور' پہاڑی کے دامن میں لہلہاتا ایک سرسبز درخت اشارے سے اسے اپنے قریب بلا رہا تھا۔ وہ درخت ایک عجیب وغریب روشنی میں نہایا ہوا تھا جس سے آنکھیں خیرہ ہوئی جا رہی تھیں۔ فضل داد کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ تب آواز دوبارہ گونجی ''فضل داد! تم مجھے تلاش کر رہے تھے نا ..... میں یہاں ہوں ..... میرے قریب آؤ۔''

فضل داد سحر زدہ سی حالت میں اٹھ کر درخت کی طرف بڑھا۔ تب اُسے احساس ہوا کہ وہ عجیب وغریب روشنی' جس کا مرکز وہ درخت تھا' درحقیقت پورے جنگل میں ہی پھیلی ہوئی تھی۔ تب فضل داد نے صرف ایک لمحے کے لئے سُر کی دیوی کو دیکھا۔ وہ بس آنکھوں کی خیرہ کر دینے والی ایک سنہری روشنی کا حسین ہیولا تھی۔ وہ ہیولا درخت کی چوٹی سے یک دم آسمان کی طرف بلند ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے ہوا میں کہیں تحلیل ہو گیا۔ بازگشت کی طرح فضا میں گونجتی ہوئی وہی آواز ایک بار پھر فضل داد کو سنائی دی ''فضل داد! آخر کار تم نے مجھے پالیا .....بس اب اپنے گھر واپس جاؤ اور لوگوں کو گانا سکھاؤ ..... میں ہمیشہ تمہارے ساتھ ہوں گی۔''

Marfat.com

فضل داد قصور واپس آ گیا۔ جب وہ اپنے گھر پہنچا تو اسے کسی نے بھی نہیں پہچانا کیونکہ وہ برسوں گھر سے دور رہا تھا اور اس کی حالت کسی مجذوب کی سی تھی۔ بہر حال ..... رفتہ رفتہ اسے پہچان لیا گیا اور لوگ اس سے ملنے کے لئے آنے لگے۔ انہیں پتا چلا کہ فضل داد کو "وردان" .....یعنی سُر کی دیوی کی سرپرستی حاصل ہو چکی ہے۔ وہ آواز کے "راز" کو پا چکا تھا۔ درحقیقت "آواز" کی اپنی ایک سائنس ہے اور اسی کا نام "سُر" ہے۔ دُنیا میں کوئی بھی آواز سُر کے بغیر نہیں ہے۔ ہر آواز کی بنیاد کوئی نہ کوئی "سُر" ہے۔ لیکن آواز کی سائنس کو سمجھنا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں۔ بہر حال ..... اس کے بعد فضل داد قصور میں موجود تمام گانے والوں کا استاد اور رہنما بن گیا۔ موسیقی سے تعلق رکھنے والے لوگ آج اسے "پیر فضل داد" کے نام سے یاد کرتے ہیں اور اسے گویا قصور میں جنم لینے والے گویوں اور موسیقاروں کا جدِ امجد قرار دیتے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ نغمگی، موسیقیت اور ترنم قصور کی مٹی میں ہی شامل ہے اور اسی لیے وہاں کے سرسبز کھیتوں کی مہک ہی الگ ہے۔ وہاں کے عام لوگوں کے درمیان ہی وہ لوگ بھی موجود ہیں جنہیں کسی خاص تربیت کے بغیر ہی فوک اور صوفیانہ کلام گانے میں ملکہ حاصل ہے۔ ہندوؤں میں سُر کی دیوی کو "سرسوتی" کہا جاتا ہے اور وہ بھی اس خیال سے متفق ہیں کہ اس علاقے کے لوگوں .....خصوصاً موسیقی کے رسیا لوگوں (سادھک) پر سُر کی دیوی کی ہمیشہ خصوصی نوازش رہی ہے۔

Marfat.com

شجرۂ نسب

پدم بھوشن استاد بڑے غلام علی خان صاحب' ڈی: لٹ

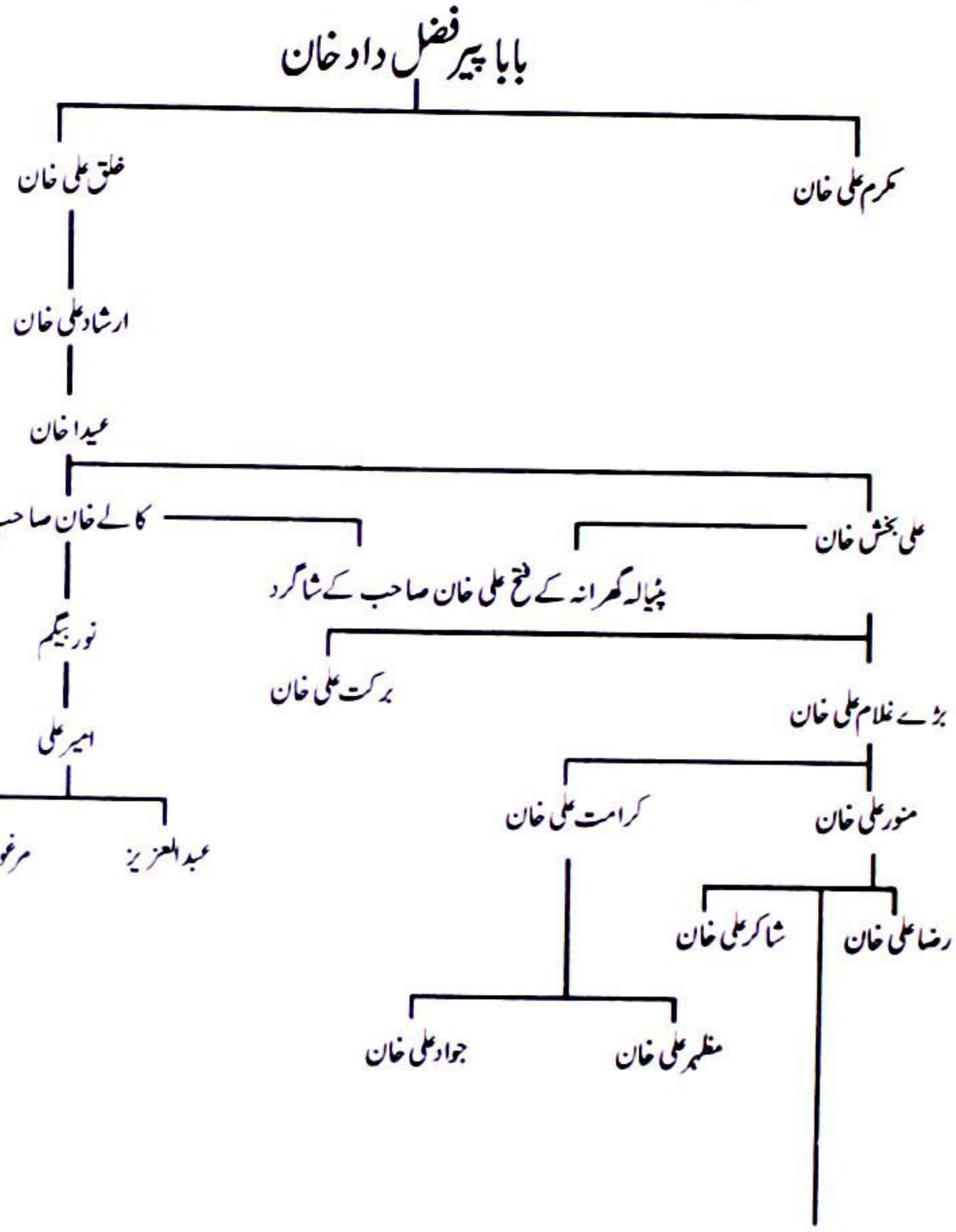

بڑے غلام علی خان صاحب کے چند خاص شاگرد:

☆ تلسی داس شرما
☆ میرا اور پراشن بنرجی
☆ نور جہاں (پاکستان)
☆ مالتی جیلانی
☆ منورما آہوجہ
☆ سندھیا مکرجی
☆ آئرین رائے چودہری

Marfat.com

موسیقی کا ورثہ

پنجاب پانچ دریاؤں کی سرزمین ہے۔ جہلم' چناب' راوی' بیاص اور ستلج ہمالیہ کی بلندیوں سے بہتے ہوئے آتے ہیں اور آگے جا کر دریائے سندھ میں مدغم ہو جاتے ہیں۔ فارسی میں ''پنج'' کا مطلب پانچ' اور ''آب'' کا مطلب' پانی ہے۔ گویا نام بھی اس امر کی عکاسی کرتا ہے کہ یہ پانچ دریاؤں کی سرزمین ہے۔ ہندوستان کی انتہائی قدیم تہذیبوں کا تعلق اس خطے سے رہا ہے جن کے آثار نالندا' ٹیکسلا اور ہڑپہ کے مقامات پر دریافت ہو چکے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ خطہ اس اعتبار سے بھی ایک عجیب پس منظر کا حامل ہے کہ صدیوں تک یہاں کتنے ہی مذاہب قومیں' نسلیں اور قبیلے دار وارد ہوتے رہے ہیں اور یکجا بھی رہے ہیں جن میں یونانی بھی شامل ہیں۔ اس لئے یہاں کی ثقافت ہمیشہ سے بڑی بھرپور اور رنگا رنگ رہی ہے۔

اسی طرح یہاں موسیقی کی روایت بھی بہت پرانی چلی آ رہی ہے جس کے دائرے میں ہندو' مسلم اور سکھ' سبھی آتے رہے ہیں۔ صوفی بزرگ بابا بلھے شاہ جن کا صوفیانہ کلام پاک و ہند کے بہت سے حصوں میں آج بھی ذوق و شوق اور عقیدت سے گایا جاتا ہے۔ قصور کی مٹی میں دفن ہیں۔ راگوں اور فوک موسیقی میں گندھی ہوئی پنجابی شاعری آج بھی نہ جانے کس کس انداز سے دور افتادہ وادیوں اور دیہات میں گائی جاتی ہے۔ ہمالیہ کی پہاڑیوں میں گوالے اور چرواہے اپنے مویشی چرانے کے دوران میں ڈوگری زبان میں حضرت علیؓ اور امام حسینؓ کی شان میں کلام پڑھتے رہتے ہیں۔ ان کے گانے کے انداز میں راگ بھیروی' کافی اور بلاول کی جھلک محسوس ہوتی ہے۔

سکھوں میں ان کی مقدس کتاب ''گرو۔ گرنتھ صاحب'' کے بول گانے والے حضرات جنہیں گرنتھی یا راگی کہا جاتا ہے' عام طور پر کلاسیکل راگوں میں گاتے

Marfat.com

ہیں۔ ہندوؤں کے شبدھ یا مسلمانوں کی قوالی کی بنیاد بھی اکثر قدیم راگ دھرپد یا خیال پر ہوتی ہے۔ منظوم عشقیہ داستانیں ہیر رانجھا' سسّی پنوں' لیلیٰ مجنوں اور صوفیانہ کلام گائی جاتی ہیں تو یہ بھی موسیقی کی ان قدیم روایتوں کے دائرے سے نہیں نکل پاتیں جو پنجاب میں پروان چڑھی ہیں۔ استاد بڑے غلام علی خان صاحب کے گھرانے نے بھی موسیقی کی اپنی قدیم روایتوں کی آبیاری کی اور بڑے فخر' محبت اور لگن سے ان روایتوں کے امین بنے۔ ان کے گھرانے کے تمام افراد نے اپنی زندگی اسی فن کی عشق' ترویج اور اسے زیادہ سے زیادہ نکھار کر دنیا کے سامنے پیش کرنے کے لئے وقف کر دی۔ منظم انداز میں کلاسیکی موسیقی کا سب سے بڑا اور اولین میلہ تقریباً سوا سو سال پہلے غیر منقسم ہندوستان میں جالندھر کے قریب ''ہاروالبھ'' کے مقام پر منعقد ہوا تھا۔ اب بھی ہر سال دسمبر میں ایک ہفتے کا یہ میلہ جالندھر میں منعقد ہوتا ہے اور بڑے بڑے نامور' لائق اور صاحب کمال گویے اور موسیقار پورے بھارت سے اس میلے میں اپنے فن کا مظاہرہ کرنے کے لئے جمع ہوتے ہیں۔ ملک کے کونے کونے سے موسیقی کے شائقین ان فنکاروں کے فن سے محظوظ ہونے کے لئے آتے ہیں اور ایک ہفتے کے لئے یہ سلسلہ دن رات چلتا رہتا ہے۔

''گندھاروا مہا ودیالہ'' کلاسکی موسیقی کو ترویج دینے والا ایک ایسا ادارہ ہے جس کی خدمات کا اعتراف کیے بغیر ہندوستانی کلاسیکی موسیقی کی تاریخ مکمل نہیں ہو سکتی۔ موسیقی کی قدیم اور طویل شاہراہ پر یہ نام ایک اہم سنگ میل ہے۔ وہ پنڈت وشنو دی گمبر نے اس ادارے کی بنیاد 5 مئی 1901ء کو لاہور میں رکھی۔ پنڈت وشنو وہ شخص ہیں جنہوں نے ہندوستانی کلاسیکی موسیقی کے ساتھ ساتھ کلاسیکل گویوں اور موسیقاروں کو معاشرے میں زیادہ باعزت مقام دلانے اور ان کے احترام میں اضافہ کرنے کے سلسلے میں اہم ترین کردار ادا کیا۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ وہ اپنے مشن کی تکمیل اور اپنے ادارے کی بنیاد رکھنے کے لے خاص طور پر لاہور گئے تھے۔

.....☆.....

Marfat.com

غلام علی پیدائش اور بچپن

وہ 2 اپریل 1902ء کا خوشگوار دن تھا۔ قصور کی مہکی ہوئی فضا میں گندم کے کھیتوں کے سنہری خوشے جھوم رہے تھے' جب استاد علی بخش خان کے گھر میں ان کی اہلیہ مائی بڈھی نے ایک بچے کو جنم دیا۔ اس بچے کی پیدائش پر خوب خوشیاں منائی گئیں۔ قصور شہر' جو اس وقت آبادی اور وسعت کے اعتبار سے درحقیقت ایک گاؤں ہی تھا ..... وہاں کے بڑے بوڑھوں نے نہ جانے کیوں اس بچے کو دیکھتے ہی پیشگوئی کی کہ وہ ایک روز لاکھوں انسانوں کے درمیان خوشیاں بکھیرے گا ..... موسیقی کی دنیا میں بہت بڑا نام پائے گا اور پوری دنیا میں اس کی شہرت ہو گی۔ حضرت علیؓ سے عقیدت کی بے بناء پر اس کا نام غلام علی ..... یعنی ''علی کا غلام'' رکھا گیا۔

قصور کے دیہی سے ماحول میں غلام علی پرورش پانے لگا۔ اس کی والدہ ایک سادہ سی عورت تھیں جو نہایت محبت اور توجہ سے اس کی پرورش کر رہی تھی۔ کمسن غلام علی بھی ان سے بڑی محبت کرتا تھا۔ میں جب اس کتاب کی تصنیف و تالیف کے لئے مواد جمع کر رہی تھی تو مجھے یاد آ رہا تھا کہ جب میں ان سے تربیت لے رہی تھی تو باتوں کے دوران میں انہوں نے بارہا جذباتی لہجے میں مجھے بتایا تھا کہ ان کی والدہ نے کس محبت اور توجہ سے ان کی اور ان کے بھائی برکت علی کی پرورش کی تھی۔ گھر میں ایسے بھی دِن

Marfat.com

آئے جب غلام علی کی والدہ کو مالی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا لیکن انہوں نے کبھی بچوں کو تنگ دستی کا احساس نہیں ہونے دیا۔ وہ کپڑے سی کر گزارہ کرتی رہیں اور سلائی کی قلیل اجرت میں بچوں کی پرورش کرتی رہیں۔

Mai Buddi - Mother of Bade Ghulam Ali Khan

بچپن سے ہی غلام علی خان صاحب کو اپنی والدہ سے گہری عقیدت اور محبت تھی۔ ایک بار وہ بیمار پڑ گئیں۔ انہیں تیز بخار تھا اور پورا جسم گویا آگ میں تپ رہا تھا۔ غلام علی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کریں۔ آخر ایک تدبیر ان کے ذہن میں آئی۔ انہوں نے ایک بڑا برتن پانی سے بھرا اور اس امید پر والدہ کے پاؤں صابن اور

Marfat.com

ٹھنڈے پانی سے دھوئے کہ شاید ان کی حرارت کچھ کم ہو جائے۔ پاؤں دھو کر انہوں نے صاف اور خشک کیے۔ پیڑوں کو دھوون یعنی صابن ملا پانی' برتن ہی میں جمع تھا۔ جذبات اور عقیدت کی شدت میں نو عمر غلام علی صاحب نے برتن کو منہ لگایا اور وہ دھوؤن پی گئے۔ ان کی والدہ حیران پریشان ہو کر انہیں روکتی ہی رہ گئی اور ڈانٹنے کے انداز امیں بولیں "بے وقوف لڑکے! یہ تم نے کیا پاگلوں جیسی حرکت کی ہے! اب تم بیمار پڑ جاؤ گے۔"

The lane in Kasur where Bade Ghulam Ali Khan was born

"میں وہ پانی پی کر کیسے بیمار ہو سکتا ہوں جس میں میری ماں کے پاؤں دھلے ہیں؟ ماں کے پیروں تلے تو جنت ہوتی ہے۔" غلام علی صاحب نے یقین اور عقیدت سے جواب دیا۔ ان کی والدہ' ان کی محبت اور عقیدت کی یہ شدت دیکھ کر فرط جذبات سے رونے لگیں۔ انہوں نے بیٹے کو ایک لمحہ پہلے ڈانٹا تھا مگر دوسرے لمحے سینے سے لگایا اور آنسوؤں سے بھیگی آواز میں بے شمار دعائیں دیں۔

Marfat.com

بچپن سے ہی غلام علی صاحب نے گلی کوچوں سے گزرنے والے سادھوؤں' فقیروں' درویشوں اور جوگیوں کو دوہے' لوک گیت' ٹپے' صوفیانہ کلام وغیرہ گاتے سن کر انہیں دہرانا شروع کر دیا تھا۔ ان کی آواز منفرد تھی اور اس عمر میں بھی وہ جو کچھ گاتے تھے' لوگ توجہ سے سننے لگتے تھے۔ والدہ انہیں سودا سلف لینے بازار بھیجتیں تو وہاں سے بھی لوگ ان سے فرمائش کرنے لگتے کہ فلاں لوک گیت ..... یا کوئی اور چیز سناؤ۔ اگر وہ حلوائی کی اس قسم کی کوئی فرمائش پوری کرتے تو وہ تحفے کے طور پر گھر لے جانے کے لئے انہیں مٹھائی پیش کرتا۔ گویا نادانستگی اور لاعلمی میں وہ بچپن ہی سے ''روزی روٹی'' کے لئے گانے لگے تھے۔ ان سے گانا سننے کے بعد اکثر دکاندار ان سے سودا سلف کے پیسے نہیں لیتے مگر جب وہ گھر آ کر پیسے والدہ کو واپس کرتے تو وہ ان پر خفا ہوتیں کہ انہیں دکانداروں کا احسان نہیں لینا چاہیے۔

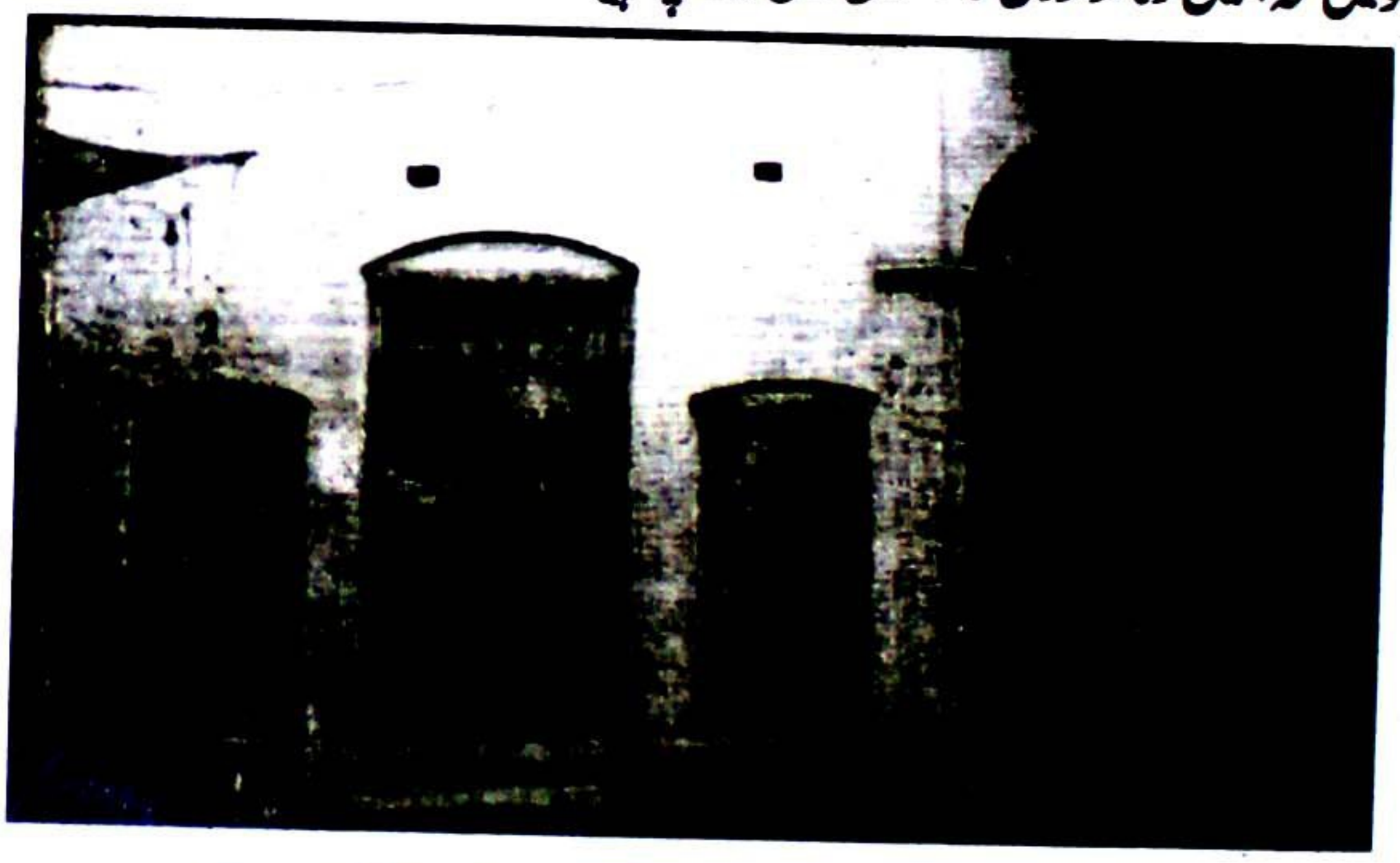

The birthplace of Ghulam Ali in Kasur

غلام علی خان صاحب کے والد علی بخش خاں ریاست جموں کشمیر کے مہاراجہ کے درباری گویے تھے اور وہیں رہتے تھے۔ وہاں انہوں نے دوسری شادی کر لی تھی۔

Marfat.com

پہلی بیوی اور بچے کو انہوں نے بالکل نظر انداز کر دیا تھا اور کافی کافی عرصے تک ان کی خیر خبر نہیں لیتے تھے۔ ایک روز وہ اتفاق سے اچانک قصور آ گئے اور انہوں نے غلام علی خان کو کوئی عامیانہ سا گانا گاتے سن لیا۔ انہوں نے بیٹے کو تھپڑ رسید کیا اور غصے سے کہا ''خاموش ہو جاؤ ..... یہ بازاری گانے گانا تمہارا کام نہیں ہے۔'' تاہم انہوں نے اس لمحے اپنے بیٹے میں گانے کی فطری صلاحیت کو محسوس ضرور کر لیا تھا۔

Halwai shop in a gali Kot Badar din in Kasur

موسیقاروں اور گویوں کے بچوں کی تربیت ایک خاص انداز میں' نہایت آہستگی سے ہوتی ہے۔ استاد' گرو یا والد پہلے تو بچے کے شوق' لگن اور قوت برداشت کا تجزیہ کرتے ہیں اور کچھ عرصہ تو خاموشی سے اس کا مشاہدہ کرتے ہیں پھر ہلکی پھلکی تربیت شروع کر کے اسے آزماتے ہیں کہ اس میں خاطر خواہ دلچسپی اور فطری صلاحیت موجود ہے یا نہیں ..... اور آیا وہ ریاض کی سختیاں سہہ سکے گا یا نہیں؟ کلاسیکل موسیقی سیکھنے والوں کی زندگی ہی گویا اس فن کے لئے مخصوص ہو کر رہ جاتی ہے۔ ان کی

Marfat.com

زندگی میں دوسری سرگرمیوں اور دلچسپیوں کے لئے گنجائش کم ہی رہ جاتی ہے۔ بقول شخصے "وہ موسیقی میں جنم لیتے ہیں اور موسیقی میں ہی مر جاتے ہیں۔"

ان کی یاد داشت اور ان کا گلا ہی گویا ان کا کارخانہ ہوتا ہے جو ہر جگہ ان کے ساتھ جاتا ہے۔ تربیت کے دوران انہیں جو کچھ گانا ہوتا ہے' اسے وہ لکھ کر اپنے سامنے نہیں رکھتے۔ ان کا حافظہ ہی گیتوں' بولوں اور سروں کی تربیت کا خزانہ ہوتا ہے جس میں لاکھوں چیزیں محفوظ ہوتی ہیں اور "سینہ بہ سینہ" چلتی ہیں یعنی باپ سے بیٹے پوتے یا پھر استاد سے شاگرد اور پھر اس کے شاگرد کو منتقل ہوتی ہیں ...... استاد اور شاگرد کا رشتہ بھی بہت سی روایتوں کا امین ہوتا ہے۔ روایتوں کے اس احترام ہی کا نتیجہ ہے کہ ہمیں دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ راگ اور راگنیاں آج بھی اپنی اسی خالص شکل میں گائی جارہی ہیں جس طرح آج سے سو سال پہلے گائی جاتی تھیں۔ گیت' بولی اور نغمہ وقت' حالات اور محفل کی مناسبت سے کچھ بھی ہو لیکن راگ اور راگنیاں وہی رہتی ہیں۔

دہلی کے مغلیہ دربار کی جو قدیم پینٹنگز عجائب گھروں میں رکھی ہیں یا عمارتوں کی دیواروں پر محفوظ ہیں' ان میں راگ اور راگنیوں کو تصویر کی صورت دی گئی ہیں۔ انہیں "موسیقی کی مصورانہ صورت" کہا جاتا ہے۔ ان میں "خیال" کی مختلف کمپوزیشنز کی عکاسی کی گئی ہے جو محبت' ہجر و وصال' اداسی یا رومان وغیرہ جیسی کیفیات کی ترجمان ہیں۔ سترہویں اور اٹھارہویں صدی کے وہ مصور جو "راجپوت سکول آف تھاٹ" سے متاثر تھے یا انیسویں اور بیسویں صدی کے آغاز کے مغلیہ دور کے مصور' دکن اور راجھستان کے مصور' یا کانگڑہ کے پہاڑی علاقے میں جنم لینے والے مصور ...... سبھی ایک پینٹنگ میں کہیں نہ کہیں کلاسیکل گائیکی کے خوبصورت اثرات سے مغلوب نظر آتے ہیں اور انہیں مصوری شکل دینے کی کوشش کرتے رہے ہیں ان پینٹنگز کو "راگ مالا" پینٹنگز کہا جاتا ہے۔

Marfat.com

Ghulam Ali with his beloved Sur Mandal

بات استاد علی بخش خان کی ہو رہی تھی ..... انہوں نے محسوس کر لیا کہ ان کے بیٹے غلام علی میں گانے کی صلاحیت قدرتی طور موجود تھی۔ الفاظ بہت جلد ان کے ذہن پر نقش ہو جاتے تھے۔ اور نہایت نازک کمپوزیشنز کو بھی وہ کم عمری میں ہی نہایت آسانی سے گانے پر قادر تھے۔ جس کمسن بیٹے کو "بازاری" گانا گانے پر علی بخش خان نے سخت سرزنش کی تھی، اسی بیٹے نے انہیں خاصی مشکل بندشیں بھی آسانی سے گا کر سنا دیں۔ اس ناتراشیدہ ہیرے کو تربیت کی ضرورت تھی مگر مسئلہ یہ تھا کہ علی بخش خان جموں میں رہتے تھے اس لئے بچے کو گائیکی کی "تعلیم" نہیں دے سکتے تھے۔ دوسری طرف علی بخش خان صاحب کے چھوٹے بھائی ..... یعنی غلام علی خان کے چچا کی اولاد صرف ایک بیٹی تھی جس کا نام نوری تھا۔

گویوں کے گھر میں بھی بیٹیوں کو گانے کی تعلیم نہیں دی جاتی تھی کیونکہ درباری گانے والیوں اور طوائفوں کی بھی اس فن تک رسائی تھی اس لئے گویے اس فن کو

Marfat.com

اپنی بیٹیوں میں منتقل کرنے کو قدرے معیوب خیال کرتے تھے۔ چنانچہ کالے خان صاحب نے بھتیجے کو اپنی توجہ اور محبت کا مرکز بنا لیا۔ انہوں نے اسی محبت اور شفقت سے غلام علی کی تربیت شروع کر دی جیسے وہ ان کے اپنے بیٹے ہوں۔ انہوں نے ایک باپ کی طرح غلام علی کو اپنا لیا تھا اور وہ گویا انہیں اپنا جانشین بنانے کی تیاری کر رہے تھے۔ غلام علی بھی ایک ہونہار اور سعادت مند شاگرد کی طرح ان کی خدمت کر رہے تھے۔ وہ اپنے ''استاد'' کے گھر کی صفائی کرتے' ان کے کے لئے کھانا بناتے' ان کے کپڑے دھوتے اور دریا سے ان کے لئے پانی بھر کر لاتے۔ اس دور میں رواج یہی تھا کہ شاگرد چوبیس گھنٹے استاد کی خدمت میں حاضر رہتا تھا اور اس کا ہر حکم بجا لاتا تھا۔ کالے خان صاحب ویسے بھی خاصے سخت گیر اور اصول پسند استاد تھے۔ وہ کہا کرتے تھے ''ماں کے پیار سے استاد کی مار اچھی ہے۔''

Barkat Ali Khan

ایک روز غلام علی خان اپنے استاد کے لئے دریا سے پانی بھرنے گئے تو بالٹی

Marfat.com

ان کے ہاتھ سے چھوٹ گئی اور دریا میں بہتی ہوئی چلی گئی۔ غلام علی خان چھوٹے ہی تھے' بے بسی سے بالٹی کو ڈوبتے دیکھنے کے سوا کچھ نہ کر سکے لیکن گھر آ کر جب انہوں یہ خبر استاد کو سنائی تو انہوں نے ایک زوردار تھپڑ سے ان کی تواضع کی۔ ویسے وہ غلام علی خان کے لئے بے حد مشفق اور نرم دِل بھی تھے لیکن روزمرہ زندگی اور فن کے معاملے میں کوئی کوتاہی یا ڈسپلن کی خلاف ورزی اُنہیں گوارہ نہیں تھی۔ تمام تر سختی سے قطع نظر دونوں استاد شاگرد اور چچا بھتیجا ایک دوسرے سے بے حد محبت کرتے تھے۔ غلام علی ان سختیوں سے نہیں گھبرائے ..... بلکہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ فن پر عبور حاصل کرنے کی لگن ان میں قوی سے قوی تر ہوتی چلی گی اور وہ زیادہ سے زیادہ محنت کے عادی ہوتے چلے گئے۔

1911ء میں کنگ جارج پنجم کی ہندوستان آمد کے موقعے پر انہیں خوش آمدید کہنے کے لئے ''دلی دربار'' منعقد کیا گیا۔ یہ درحقیقت کنگ جارج پنجم کے اعزاز میں منعقد ہونے والی کئی روزہ تقریب تھی جس میں ہندوستان بھر کے عمدہ اور مشہور کھانوں' گانے' بجانے' رقص اور کھیل' تماشوں کے ذریعے شہنشاہ کی خاطر مدارت کا پروگرام بنایا گیا تھا۔ ہندوستان بھر سے راجے' مہاراجے اور نواب اس تقریب میں شرکت کے لئے جمع ہوئے۔ سب کے ساتھ اپنے اپنے علاقے کے مشہور اور چیندہ فنکار بھی آئے تھے جن میں رقص و موسیقی کے ماہرین' بڑے گویے اور دیگر فنون کے اعلیٰ درجے کے ماہرین شامل تھے۔ ایک بہت بڑے میدان میں راجوں' مہاراجوں اور نوابوں کے شاندار اور پُرتعیش خیمے نصب کر دیے گئے تھے۔

اس کئی روزہ تقریب میں شرکت کے لئے استاد کالے خان صاحب کو بھی مدعو

Marfat.com

کیا گیا تھا اور غلام علی خان بھی ان کے ساتھ تھے۔ اس وقت ان کی عمر صرف نو سال تھی۔ استاد کالے خان صاحب نے راجوں' مہاراجوں' نوابین اور دیگر معززین کی ایک خاص محفل میں اپنے فن کا مظاہرہ کیا۔ ان کی خدمت میں تحفے کے طور پر اشرفیوں کی ایک تھیلی پیش کی گئی۔ طلائی سکّوں کی یہ تھیلی لے کر کالے خان صاحب خوشی خوشی گھر

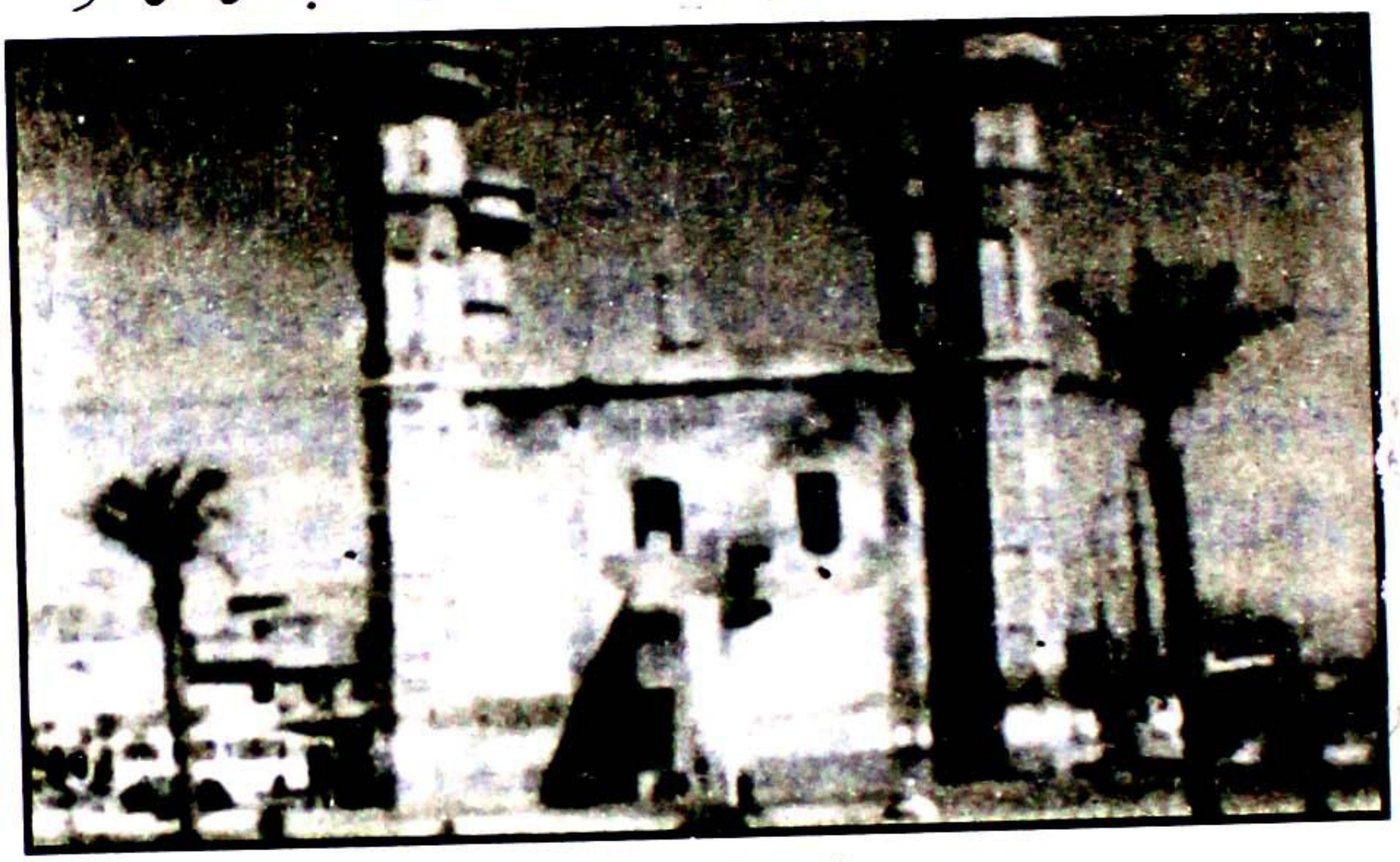

Chaar Burji

واپس آ گئے اور اسے تکیے کے نیچے رکھ کر سونے کے لئے لیٹ گئے ..... لیکن طلائی سکّوں کی فکر میں وہ تمام رات سو نہیں سکے۔ یہ اندیشہ تو تھا ہی ..... کہ سکّے چوری نہ ہو جائیں ..... اس کے ساتھ ساتھ کالے خان صاحب کو یہ خوف بھی محسوس ہوتا رہا کہ ان بیش قیمت سکّوں کی خاطر کوئی انہیں قتل ہی نہ کر دے۔ وہ تھیلی ایک چھوٹے موٹے خزانے سے کم نہیں تھی۔ دوسری صبح کالے خان صاحب بستر سے اٹھے تو فیصلہ کر چکے تھے کہ وہ ان قیمتی طلائی سکّوں سے نجات حاصل کر لیں۔ ان کے خیال میں انسان کا چین' سکون اور رات کی نیند' بیش قیمت طلائی سکّوں سے زیادہ اہم تھی۔ چنانچہ وہ تھیلی اٹھا کر گھر سے نکلے اور تمام سکے اپنے دوستوں' عزیزوں اور رشتے داروں میں تقسیم

Marfat.com

کر دیے۔ رات کو انہوں نے بڑے آسودہ لہجے میں کمسن غلام علی سے کہا "لو بیٹا! اب ہم سکون کی نیند سو سکتے ہیں۔ اب ہمیں یہ دھڑکا نہیں لگا رہے گا کہ کہیں کوئی چور' ڈاکو ہمارا گلا کاٹ کر سونے کے سکّوں کی تھیلی نہ لے جائے"۔

دہلی کے اس دورے نے غلام علی کے ذہن پر خاص اثرات مرتب کیے تھے۔ انہیں اندازہ ہوا تھا کہ ایک بڑے مجمع کے سامنے ..... اور خاص طور پر راجوں' مہاراجوں' نوابوں اور دیگر معززین کے سامنے گانا کیا معنی رکھتا تھا۔ یہ ایک بہت بڑا چیلنج تھا کیونکہ ان حاضرین محفل میں بیشتر لوگ فن شناس اور ناقدین ہوتے تھے۔ اب غلام علی خان پر اپنے چچا کی اہمیت بھی واضح ہو گئی تھی۔ وہ اب اور بھی زیادہ توجہ اور دھیان سے ان سے تربیت حاصل کرنے لگے۔ ایک روز کالے خان صاحب کے ساتھ تربیتی نشست کے دوران غلام علی خان ان کے گائے ہوئے کچھ مشکل بول دہرا رہے تھے۔ بول کچھ ایسے تھے کہ کالے خان صاحب کی تقلید میں انہیں گاتے وقت غلام علی خان صاحب کا چہرہ بگڑ گیا۔ کالے خان صاحب نے ان کے منہ پر تھپڑ رسید کیا اور تاکید کی کہ مشکل سے مشکل بول کی ادائیگی کے وقت بھی گویے کا چہرہ بگڑنا نہیں چاہیے۔ یہ بھی گائیکی کے فن کا ایک اہم پہلو ہے۔ اس کے بعد کئی دن تک غلام علی خان آئینے کے سامنے بیٹھ کر مشق کرتے رہے کہ کسی بھی بول کی ادائیگی کے دوران ان کے چہرے کے عضلات آڑے ٹیڑھے نہ ہوں اور ان کا چہرہ بگڑنے نہ پائے۔ کالے خان صاحب کا کہنا تھا کہ گلے سے سُر بھی صحیح نکلے اور چہرہ بھی بگڑنے نہ پائے' یہی ایک اچھے گویے کی پہچان تھی۔ غلام علی خان نے بھی باقی زندگی کے لئے یہ کمال حاصل کر ہی لیا۔ جن دنوں غلام علی خان گانے کی تربیت حاصل کر رہے تھے' وہ ان کے لئے

Marfat.com

ایک خاصا کٹھن دور تھا۔ مالی مشکلات درپیش تھیں ان کے چھوٹے بھائی برکت علی خاں گھر کا خرچ چلانے کے لئے ایک درزی کے ہاں ملازم تھے جہاں وہ کام بھی سیکھ رہے تھے اور انہیں تھوڑے بہت پیسے بھی مل جاتے تھے۔ ایک روز بڑے بھائی غلام علی خان نے چھوٹے بھائی برکت علی خان کو ایک مشہور اور مقبول ٹھمری گاتے ہوئے سن لیا۔

"باغوں میں پڑے جھولے
تم بھول گئے ہم کو
ہم تم کو نہیں بھولے"

برکت علی کی آواز سن کر غلام علی خان حیران رہ گئے۔ اس آواز میں بے پناہ مٹھاس اور نغمگی تھی۔ غلام علی خان نے فوراً فیصلہ کن لہجے میں چھوٹے بھائی سے کہا "برکت علی! درزی کی دوکان پر جانا چھوڑو اور کل سے گانا سیکھنا شروع کرو۔ تمہاری آواز سن کر مجھے بڑی خوشی اور حیرت ہو رہی ہے۔"

برکت علی خان کی معمولی سی آمدنی بند ہونے سے ان کی والدہ کی مالی پریشانیوں میں کچھ اور عرصے کے لئے تو اضافہ ہوا ہو گا لیکن اس کے نتیجے میں ایک انقلابی تبدیلی یہ آئی کہ برکت علی خان آگے چل کر ایک نہایت مقبول گویے ثابت ہوئے۔ موسیقی کی دنیا میں انہوں نے بھی بڑا نام پایا۔ نوجوانی میں غلام علی خان ایک روز بازار میں گھوم رہے تھے کہ ایک کباڑی کے ہاں انہیں ایک پرانا بربط رکھا نظر آیا۔ بربط ایک قدیم فلسطینی ساز ہے جسے انگریزی میں سالٹری(PSALTERY) کہا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام' جنہیں موسیقی سے بھی دلچسپی تھی' اس ساز کو بجا چکے ہیں اور دعایا حمد کے بول اس کی دھن پر گا چکے ہیں۔ قدیم یونانی اور رومی

Marfat.com

پینٹنگز میں بھی اس ساز کی تصویر نظر آتی ہے۔ غلام علی خان نے پانچ روپے میں وہ ساز دکاندار سے خرید لیا لیکن یہ پانچ روپے دکاندار کو دینے کے لئے ان کے پاس نہیں تھے۔ دکاندار نے کمال مہربانی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا "کوئی بات نہیں ..... جب تمہارے پاس ہوں تو دے دینا۔"

Ghulam Ali as a young man

Marfat.com

شاید اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ جس شخص کو وہ غیر معینہ مدت کے لئے ادھار پر وہ ساز پانچ روپے میں دے رہا ہے' اس کا نام کلاسیکی موسیقی کی تاریخ میں امر ہو گا اور وہ ساز زندگی بھر کے لئے اس کا ساتھی ہو گا۔ گھر آ کر غلام علی خان نے بربط کو اچھی طرح صاف کیا ..... اس کا زنگ اتارا ..... اس کی تاروں کو درست طریقے سے کسا اور اسے ''سُر منڈل'' کا نام دیا۔ اس کے بعد یہ سُر منڈل زندگی بھر غلام علی خان کا ساتھ رہا۔ آج بھی تمام کلاسیکل گانے والے اسے تانپورے' سارنگی اور طبلے کے ساتھ استعمال کرتے ہیں۔ غلام علی خان نے اس تصور کے ساتھ اس ساز کا استعمال شروع کیا تھا کہ اسے حضرت داؤد علیہ اسلام بھی استعمال کرتے تھے اور جب وہ اس کے ساتھ حمد یا دعا کے بول گاتے تھے تو کائنات جھوم اٹھتی تھی۔ ان کی تمنا تھی کہ وہ بھی کبھی اس ساز کے ساتھ اس طرح گا سکیں کہ موسیقی کی دنیا میں ان کا نام غیر فانی ہو جائے۔

یہی وہ وقت تھا جب ریاض کی سختیوں میں غلام علی خان کی شخصیت ایک بڑے گویے کے روپ میں ڈھل رہی تھی۔ وہ ان کا نوجوانی کا دور تھا۔ راتوں کو وہ لاہور کی چوبرجی میں چلے جاتے جو ایک مقبرہ تھا۔ اس زمانے میں اس کے ارد گرد ویرانہ تھا۔ چوبرجی میں بیٹھ کر غلام علی خان اپنے گلے کی پوری توانائی استعمال کرتے ہوئے' خوب کھل کر گاتے۔ مقبرے کے در و دیوار کے درمیان ان کی آواز گونجتی تو رات کے سناٹے میں دور دور تک فضا میں ایک عجیب سا ارتعاش پیدا ہو جاتا۔ وہاں ان کی گائیکی میں مخل ہونے والی کوئی اور آواز نہیں ہوتی تھی جس سے انہیں حوصلہ ملتا اور وہ مزید قوت سے گاتے اور بعد میں اس موضوع پر مجھ سے بات کرتے ہوئے کہا تھا ''پتر! اگر گویے نے صحیح معنوں میں ریاض کیا ہو تو وہ اسے زندگی میں کبھی دھوکا نہیں دیتا۔''

Marfat.com

وہ عبدالرحیم خانِ خاناں کے اس دوہے پر بڑا یقین رکھتے تھے:

''جن ڈھونڈیاں تن پائیاں
گہرے پانی پیٹھ
میں برہن ڈوبن ڈری
رہی کنارے بیٹھ''

اس دوہے کا مفہوم یہ ہے کہ جس میں کچھ پانے کی جستجو تھی' اس نے گہرے پانی میں چھلانگ لگائی اور گوہر مراد پالیا۔ میں بد نصیب ڈوبنے سے ڈرتی رہی اور کنارے پر بیٹھی رہی۔ میرے ہاتھ کچھ نہ آیا۔

غلام علی خان ایک ایسی حساس روح کے مالک تھے جو کرۂ ارض پر پیدا ہونے والی ہر آواز سے متاثر ہوتی تھی۔ ان کے مزاج پر ہر آواز کے مدوجزر کے اثرات مرتب ہوتے تھے۔ بجلی کا کڑکا' بادل کی گرج اور اس کے بعد بارش کا ترنم .....ان سب میں ان کے لئے کتنے ہی معانی اور مفاہیم چھپے ہوئے تھے۔ ان کے نزدیک یہ سب آوازیں درحقیقت قدرت کے اشارے تھے جن میں فطرت اپنا مفہوم بیان کرتی تھی۔ یہ آوازیں ان کی روح کی گہرائیوں میں اتر جاتی تھیں اور جب وہ اپنے الاپ یا تان کی مشق کرتے تھے تو گویا اپنے آپ کو فطرت کے ساتھ ہم آہنگ کر لیتے تھے۔ ڈوب کر ریاض کرنے کی عادت نے انہیں ایک بے مثال گویا بنانے کے ضمن میں اہم کردار ادا کیا۔

1918ء میں جب غلام علی خان صرف سولہ سال کے تھے' استاد کالے خان صاحب کا اچانک کانپور میں انتقال ہو گیا۔ کہا جاتا ہے کہ انہیں ان کے حاسد حریفوں نے کسی طریقے سے زہر دے دیا تھا۔ ان کی موت کی خبر سن کر قصور اور لاہور میں اظہار افسوس کے بعد لوگوں نے بے ساختہ کہا .....آہ ..... خدایا ..... کالے خان اس دنیا

Marfat.com

سے چلے گئے .....! ان کے خاندان میں بھلا اب کون ان کی جگہ لے سکے گا .....''!

اس تبصرے سے غلام علی خان صاحب کا دل مجروح ہوا اور ان کی انا کو بھی ٹھیس لگی۔ اس وقت انہوں نے عہد کیا کہ وہ بھی اپنے چچا کی طرح کامیاب اور مشہور ہو کر دکھائیں گے۔ اسی دوران غلام علی کی والدہ نے بہ اصرار ان سے کہا کہ وہ اپنے والد کے پاس جموں چلے جائیں جہاں ان کے سرپرستی میں آسانی سے گزر اوقات کے علاوہ وہ اپنے فن کو مزید نکھار سکتے تھے۔ گویوں کے گھرانوں کی عورتیں گو کہ پردے میں رہتی تھیں اور گانے یا موسیقی کی تربیت حاصل نہیں کرتی تھیں لیکن گھر میں مردوں کو ریاض کرتے اور گائیکی کی باتیں سنتے سنتے انہیں بھی ان معاملات سے واقفیت ہو جاتی تھی اور ان میں اس فن کی سوجھ بوجھ پیدا ہو جاتی تھی۔ وہ اس ضمن میں مشورے بھی دے سکتی تھیں۔ غلام علی نے والدہ کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے جموں جانے کا رخ کیا۔ اس زمانے میں لوگ لاہور سے تانگے میں جموں جاتے تھے۔ غلام علی خان بھی تانگے میں جموں پہنچے۔

غلام علی خان کے والد علی بخش خان نے اُنہیں دیکھ کر خوشی کا اظہار کیا لیکن دوسری بیوی کی وجہ سے انہیں اپنے ساتھ رکھنے سے معذوری ظاہر کی تاہم انہوں نے غلام علی کو اپنی ایک شاگرد کے پاس رہنے کے لئے بھیج دیا جو ایک طوائف اور درباری رقاصہ تھی۔ وہ عورت کہنے کو تو ایک طوائف تھی لیکن اس کا دل گویا سونے کا تھا۔ اس نے علی بخش خان کی نوعمر بیٹے کو بہت محبت اور شفقت سے نہ صرف اپنے پاس رکھا بلکہ اس دوران میں غلام علی خاں تھوڑے سے بیمار ہو گئے تو جی جان سے ان کی تیمارداری کی۔

اس زمانے میں پکھراج بھی علی بخش خان صاحب سے گائیکی کی تعلیم حاصل کر رہی تھیں اور ان کی باقاعدہ شاگرد تھیں۔ برسوں بعد ایک بار میری ان سے دہلی میں ملاقات ہوئی تو علی بخش خان صاحب کے تذکرے پر ملکہ پکھراج نے کہا کہ وہ ایک

Marfat.com

بے مثال فنکار تھے اور برصغیر پاک و ہند میں آج تک ان کے پائے کا گویا پیدا نہیں ہوا۔ فن میں یکتا ہونے کے ساتھ ساتھ استاد علی بخش خان صاحب انتہائی وجیہہ اور جاذب نظر شخصیت کے مالک تھے جن کے بارے میں مشہور تھا کہ اکثر عورتیں ان پر فریفتہ ہو جاتی تھیں۔ ایک بار وہ دربار میں گانے کے لئے آئے تو خوبصورت سیاہ شیروانی' سفید چوڑی دار پائجامے اور گلابی پگڑی میں تھے۔ وہ اتنے خوبصورت لگ رہے تھے کہ مہاراجہ کی شخصیت ان کے سامنے ماند پڑ گئی اور یہ بات مہاراجہ سے برداشت نہ ہوئی۔ اس نے فوراً کہہ کر علی بخش خان کو گھر واپس روانہ کر دیا''جاؤ .....اور اپنا لباس تبدیل کر کے آؤ۔

راجہ کا مقصد یہ تھا کہ وہ لباس کے معاملے میں کوئی خصوصی اہتمام کرنے کے بجائے عام اور سادہ لباس پہن کر آئیں۔ علی بخش خان صاحب مہاراجہ کا حکم بجا لائے اور ھر جا کر سادہ سی سفید شیروانی' سفید پائجامہ اور سفید پگڑی پہن کر آ گئے .....مگر قدرت کی ستم ظریفی دیکھیے کہ وہ اس لباس میں پہلے سے بھی خوبرو اور جامہ زیب لگ رہے تھے!

علی بخش خان چونکہ اپنی دوسری بیوی کو ناراض کرنا نہیں چاہتے تھے اس لئے چھپ کر اپنے بیٹے سے ملنے طوائف کے مکان پر جاتے تھے اور وہیں اسے موسیقی کی تعلیم دیتے تھے۔ انہوں نے غلام علی خان کو سات سُروں کو بیک وقت اوپر سے نیچے اور نیچے سے اوپر کی طرف گانے کا ایک خصوصی طریقہ سکھایا جو خالصتاً ان کی اپنی ایجاد تھا۔ اسے انہوں نے ''پلٹا'' کا نام دیا تھا۔ انہوں نے غلام علی خان کو ہدایت کی کہ وہ پورا سال اس کی مشق کریں اور اس میں کمال حاصل کریں۔ غلام علی خان کو ایک سال سے پہلے ہی جموں سے واپس لاہور آنا پڑا۔ یہاں وہ پلٹے کی مشق کرنے کے ساتھ ساتھ مزید ریاض بھی کرتے رہے۔ اپنے والد اور چچا سے انہوں نے جو کچھ سیکھا تھا' اس میں بھی زیادہ سے زیادہ مہارت حاصل کرنے کی کوشش کرتے رہے۔

Marfat.com

Autugraphed photograph of
Bade Ghulam Ali Khan as a young man

غلام علی خان اب اپنی والدہ کے ساتھ لاہور میں رہ رہے تھے۔ جلد علی بخش خان بھی لاہور آ گئے۔ غلام علی خان نے جو کچھ سیکھا تھا' وہ اپنے والد کے سامنے پیش کرنے کے لئے بے تاب اورر مشتاق تھے۔ انہوں نے والد کے سامنے راگ المین میں الاپ شروع کیا پھر خیال کی تیزی سے .....یعنی درت میں گایا اور اسی دوران

Marfat.com

میں ''پلٹے'' کی بھی بنت کر دی۔ ان کے والد بھی ان کی مہارت کی داد دیئے بغیر نہ رہ سکے۔ انہوں نے اس میں اس درجہ کمال حاصل کر لیا تھا کہ جب وہ گا رہے تھے تو محسوس ہو رہا تھا کہ موتی فرش پر بکھر رہے ہیں۔ بعد میں جب آصف نے ''مغل اعظم'' بنائی اور استاد بڑے غلام علی خان صاحب کو اس فلم میں تان سین کے کردار کے لئے گانے پر بہ مشکل آمادہ کیا تو خان صاحب نے یہی بندش اس پس منظر میں گائی جب شہزادہ سلیم جنگ میں فتح حاصل کرنے کے بعد گھر واپس آتا ہے۔ اس کے راستے میں موتی بکھیرے جاتے ہیں اور پس منظر سے تان سین (استاد بڑے غلام علی خان صاحب) کے گانے کی آواز ابھرتی ہے کہ آصف کو شہزادے کی راہ میں موتی بکھیرنے کا آئیڈیا غلام علی صاحب نے ہی دیا تھا اور اس موقع پر انہوں نے جو بول گائے وہ بھی ان کے اپنے ہی لکھے ہوئے تھے ''شُبھ دن آئے .....'' یہ بول انہوں نے راگ راگیشر ی میں گائے۔

غلام علی خان صاحب نے اپنے والد کے سامنے اپنے فن کا مظاہرہ کرنے کے بعد دھڑکتے دل سے پوچھا ''ابّا! مجھے کچھ گانا آیا بھی ہے یا نہیں''؟

علی بخش خان کی مسرت دیدنی تھیں۔ انہوں نے بیٹے کے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا ''پتر! ہماری سات نسلوں میں تجھ جیسا گانے والا پیدا نہیں ہوا ..... اور نہ آئندہ تیرا ہمسر پیدا ہونے کی امید ہے۔

اپنے والد کے منہ سے اپنے فن کا یہ اعتراف اور یہ ہمت افزاء جملے سن کر غلام علی خان کی مسرت کی انتہا نہ رہی!

.....☆.....

Marfat.com

نوجوان غلام علی کی شہر سے شناسائی

نوجوانی میں غلام علی لاہور شہر کی رنگینی سے کسی حد تک اس وقت آشنا ہوئے جب ان کی ملاقات ایک متموّل اور اعلیٰ خاندانی پس منظر رکھنے والے نوجوان' فیروز سے ہوئی۔ فیروز' ریاست خیر پور' سندھ کے والی کے سالے تھے۔ خیر پور ان دنوں ریاست تھی اور اس کے والی کو میر کہا جاتا تھا۔ فیروز اکثر لاہور آتے رہتے تھے۔ وہ سیر و تفریح کے شائق اور شہر کی رنگینیوں سے آشنا تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ فن شناس اور موسیقی کے دلدادہ بھی تھے۔ ان کی نوجوان غلام علی سے دوستی ہو گئی جو خاصی حد تک شرمیلے تھے اور ان دنوں موچی گیٹ کے علاقے میں رہ رہے تھے۔ لاہور کو ان دنوں ایشیا کے پیرس کی حیثیت حاصل تھی۔ فیروز کی ہمراہی میں غلام علی نے پہلی بار لاہور شہر کی رنگینیوں کو قریب سے دیکھا۔ فیروز انہیں اپنی شاندار' قیمتی اور چمکتی دمکتی کار میں ساتھ لیے پھرتے۔ سیر سپاٹا کرتے وہ شہر کے مضافات میں بھی نکل جاتے۔ فیروز اگر اس دوران کسی پرندے کو بیکراں فضاؤں میں اڑان بھرتے دیکھتے تو غلام علی سے فرمائش کرتے کہ وہ کوئی ایسی تان لگائیں جس سے پرندے کی اونچی اڑان کی عکاسی ہوتی ہو۔ کبھی انہیں کسی ریلوے کراسنگ پر رکنا پڑتا اور ٹرین ان کے سامنے سے گزرتی تو فیروز ان سے فرمائش کرتے کہ کوئی ایسی تان لگائیں جس سے ٹرین کی گھن گرج اور

Marfat.com

پڑیوں پر اس کے پہیوں سے پیدا ہونے والی دھمک اور ارتعاش کا تاثر ملتا ہو۔ غلام علی کو آواز اور سُر پر اتنا عبور حاصل تھا کہ اس قسم کی فرمائشیں پوری کرنا ان کے لئے ذرا بھی مشکل نہ تھا۔ شام ڈھلے فیروز تفریح اور رنگینی کی تلاش میں لاہور کے اس علاقے کا رخ کرتے جسے شاہی محلّہ اورعرف عام میں ہیرا منڈی کہا جاتا تھا۔ یہ 1920ء کی دہائی کے آغاز کا ذکر ہے۔ اس زمانے میں بڑے بڑے گھرانوں میں طوائفوں کو مجرے کے لئے مدعو کیا جانا کوئی معیوب بات نہیں سمجھی جاتی تھی۔ بہت سی طوائفیں نہایت شائستہ، مہذب اور ماہر فن تھیں۔ ان کی حیثیت فنکاراؤں کی تھی۔ ان کے گانوں کے ریکارڈ آل انڈیا ریڈیو پر بجتے تھے اور وہ خاصی نامور ہوتی تھیں۔ نہایت اونچے گھرانوں میں بھی انہیں فخر سے مدعو کیا جاتا تھا۔ ویسے معاشرے میں عورت مرد کا زیادہ اختلاط یا ایسی پارٹیز اور تقریبات کا رواج نہیں تھا جن میں مرد و زن دونوں اکٹھے شرکت کرتے ہوں۔ خوش حال اور اونچے گھرانوں کے مردوں کی تفریح یا خواتین سے شناسائی کا ذریعہ یہی مجرے اور محفلیں تھیں۔ بعض فنکار طوائفوں کو آل انڈیا میوزک کانفرنس میں بھی مدعو کیا جاتا تھا۔ تہذیب و شائستگی کے ضمن میں اس قسم کی طوائفوں کی مثالیں دی جاتی تھیں اُمور وہ بڑے منفرد اور شاہانہ انداز میں زندگی بسر کرتی تھیں۔ معاشرے میں ان کا مقام اور طرز زندگی قدیم فرانسیسی معاشرے کی DEMI MONDAINES اور جاپان کی گیشا گرل GEISHA GIRL سے مشابہ تھا جو اپنے دور میں تہذیب، شائستگی اور شاہانہ طرز زندگی کی علامت تھیں۔

غلام علی خان جب بیس سال کے تھے تو انہیں اپنے والد کے ساتھ لکھنؤ جانے کا موقع ملا جہاں باپ بیٹے نے اودھ کے تعلقہ داروں کی ایک خصوصی محفل میں گایا۔

Marfat.com

لکھنؤ کے آس پاس چھوٹے چھوٹے قصبوں اور دیہات میں بھی نامی گرامی استاد گویے رہتے تھے۔قریبی شہر فیض آباد میں بیگم اختر رہتی تھیں۔فیض آباد ان کا آبائی شہر تھا اور وہ اختر بیگم فیض آبادی کے نام سے پورے برصغیر میں مشہور ہوئیں۔

Bade Ghulam Ali Khan as a young man with curly hair

Marfat.com

ایک روز غلام علی اور ان کے بھائی برکت علی لکھنؤ کے ایک گرم حمام میں نہانے گئے تو وہاں ان کی ملاقات معروف گویئے استاد نذیر خان سے ہوئی۔ وہ انہیں ایک نہایت باذوق طوائف عین بائی کے ہاں لے گئے جس کا کوٹھا قریب ہی تھا۔ عین بائی پورے لکھنؤ میں مشہور تھی۔ اس کے کوٹھے پر پہنچ کر تعارف اور رسمی باتوں کے بعد استاد نذیر خان نے غلام علی خان سے کہا "تمہیں اپنے چچا استاد کالے خان اور اپنے والد علی بخش خان' دونوں سے تربیت حاصل کرنے کا موقع ملا ہے ..... جو کوئی معمولی بات نہیں ہے ..... لیکن کیا تم سرگم کو اپنی مقرر کردہ آواز کی حدود سے زیادہ اونچی حد میں گا سکتے ہو"؟

غلام علی نے جواب دیا "اللہ تعالیٰ کے کرم اور آپ کی دعا سے میں سرگم کو آواز کی نیچی سے نیچی اور اونچی سے اونچی حد تک گا سکتا ہوں"۔

غلام علی خان صاحب کے اس دعوے کی تصدیق کے لئے فوراً ساز منگوائے گئے۔ تان پورے کی تاروں کو ٹیون کیا گیا۔ طبلہ نواز نے اپنے طبلے کو کسا' ہارمونیم پر استاد نذیر خان خود بیٹھے اور غلام علی خان نے گانا شروع کیا۔ انہوں نے پہلے ہارمونیم کے نچلے نیچے سُروں سے بھی نیچی آواز میں گایا' پھر تان بلند کی اور کرتے ہی چلے گئے۔ آخر کار استاد نذیر خان نے کانوں کو ہاتھ لگایا اور غلام علی خان کی عظمت کو مان گئے۔ عین بائی بھی غلام علی خان کے آگے بچھنے لگی۔ اس نے درخواست کی کہ غلام علی خان صاحب چند دن اس کے گھر میں مہمان رہ کر اسے عزت بخشیں۔ غلام علی خان صاحب نے یہ درخواست قبول کر لی۔

شام کو عین بائی کے ہاں محفل سجی۔ لکھنؤ کے بہت سے معززین وہاں جمع تھے۔

Marfat.com

بن بائی نے غلام علی خان صاحب سے درخواست کی کہ وہ ان کے سامنے گائیں۔ غلام
لی خان صاحب نے گایا اور نین بائی خود پس منظر میں رہی۔ فن شناس معزز سامعین
لام علی خان کو سن کر حیران رہ گئے۔ اس قسم کی محفلوں کے ذریعے چند ہی روز میں غلام
لی خان صاحب کو لکھنؤ کے اعلیٰ طبقے سے شناسائی کا موقع ملا۔ لکھنؤ اس وقت اودھ کا
ارالحکومت اور فن و ثقافت کا بہت بڑا مرکز تھا۔ اودھ کے نوابین فنون لطیفہ کے بہت
ڑے قدر دان اور سرپرست تھے۔

نبن بائی کے ہاں اس کے مہمان کی حیثیت سے چند دن گزار کر غلام علی خان
گویا اپنی ''حدود'' سے کچھ آگے چلے گئے تھے۔ چنانچہ جب وہ لکھنؤ میں اپنی اس عارضی
یام گاہ پر واپس پہنچے جہاں والد ان کے منتظر تھے تو انہیں خوب ڈانٹ پڑی۔ والد
احب نے کہا ''بس ..... بہت ہو چکی۔ کل حجام آئے گا اور تمہارے یہ لمبے
ھنگھریالے بال استرے سے مونڈ کر تمہیں گنجا کر دے گا۔ لگتا ہے' ان کی وجہ سے
ورتیں تم میں اور بھی زیادہ کشش محسوس کرتی ہیں۔ ویسے بھی اب ہمیں لاہور واپس جانا
ہے۔''

دوسرے روز واقعی حجام آیا ور اس نے غلام علی خان صاحب کا سر مونڈ دیا۔
لام علی منڈے ہوئے سر کے ساتھ ہی نبن بائی کو خدا حافظ کہنے پہنچے۔ یہ کچھ ایسا ہی تھا
یسے سمیسن' جس کی ساری طاقت اس کے بالوں میں تھی' ان سے محروم ہونے کے بعد
یلا ٹیلا کو خدا حافظ کہنے پہنچا تھا!

☆☆☆☆☆☆

Marfat.com

دریائے راوی کے کنارے ریاض

باپ بیٹا لاہور لوٹ آئے اور غلام علی خان نے اپنا ریاض کا معمول دوبارہ
شروع کر دیا۔ اب رات کو وہ دریائے راوی کے کنارے جا بیٹھتے۔ چاند کے نکلنے سے
لے کر سورج کے نکلنے تک وہ وہیں ریاض کرتے۔ دریا کے مدہم لہروں کی روانی میں
رات کے گہرے سکوت کے دوران دھیما سا ترنم محسوس ہوتا جو غلام علی کی روح کو ایک
عجیب سی خوشی سے سرشار کر دیتا۔ ان کے دل میں گویا ایک نیا جذبہ اُبھراتا۔ وہ لکھنؤ
میں امراؤ اور نوابین کی حویلیوں اور محفلوں میں بھی شرکت کر کے آئے تھے۔ ذہن و دل
پر ان ایام کی یادوں کا خمار بھی باقی تھا۔ ان محفلوں میں شرکت کے بعد غلام علی کو گو
ایک نیا حوصلہ ملا تھا اور یہ عزم ان کے دل میں مضبوط تر ہو گیا تھا کہ انہیں کچھ بننا ہے
کچھ کر کے دکھانا ہے اور موسیقی کی دنیا میں بڑا مقام حاصل کرنا ہے۔ انہوں نے گو
اپنے آپ کو صرف اور صرف موسیقی کے لئے وقف کر دیا تھا۔ موسیقی ان کا اوڑھنا بچھو
تھی۔ موسیقی کے سوا وہ کسی چیز کے بارے میں نہیں سوچتے تھے اور ہر وقت اسی میدا
میں اپنی صلاحیتوں کو بڑھانے کے لئے کوشاں تھے۔ انہوں نے اپنے آپ کو خا
معمولات کا بھی عادی بنا لیا تھا جن میں سب سے زیادہ وقت وہ ریاض کو دیتے تھے
وہ انتہائی سخت ریاض کر رہے تھے۔ سخت محنت کے ان برسوں میں گائیکی پر زیادہ

Marfat.com

یادہ عبور حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ غلام علی خان صاحب نے ایک اور حیرت انگیز
لاحیت حاصل کی۔ وہ کائنات کی ہر فطری آواز' چیزوں اور مخلوقات کی نقل و حرکت
غیرہ کی ترجمانی سُروں کے ذریعے کر سکتے تھے اور ہر تاثر کو اپنی گائیکی میں سمو سکتے
تھے۔ وہ جب دریا کے کنارے بیٹھتے تو آسمان کے بدلتے رنگ' ستاروں کی جھلملاہٹ
ر چاند کی کرنیں ان کے جذبات اور خیالات میں ایک عجیب ہلچل پیدا کر دیتیں اور وہ
پنے تمام محسوسات کو اپنی ''گائیکی میں سمونے لگتے۔ پورے چاند کی رات .....
ے ہندی میں ''شرد پورینما'' کہا جاتا ہے ..... دریا' سمندر اور ویرانوں پر ایک
لک ہی اثر رکھتی ہے۔ خاص طور پر اکتوبر کے مہینے میں جب پورا چاند طلوع ہوتا ہے تو
ں کا رنگ انوکھا ہوتا ہے۔ اس وقت نقرئی چاندنی میں گویا طلائی رنگ کی بھی آمیزش
جاتی ہے۔ یعنی سونا اور چاندی گویا ایک دوسرے میں مدغم ہو جاتے ہیں اور ہر چیز
ں انوکھی چاندنی میں نہا جاتی ہے۔ غلام علی صاحب نے چودھویں کے اس چاند کو
وب تصور کرتے ہوئے گانا ترتیب دیا:

پیا کی چھب' دیکھی نائیں رے
سب سُو ری آلی.....

اس گانے کا مفہوم کچھ یوں تھا کہ محبوب کی صورت صحیح طور پر دیکھی نہیں جا
ا کیونکہ چودھویں کے چاند کی طرح کبھی وہ سامنے آجاتا ہے اور کبھی بادلوں کی اوٹ
چلا جاتا ہے۔ جب اس کی صورت نظر آتی ہے تو ہر طرف روشنی پھیل جاتی ہے۔
ذ بھی درحقیقت محبوب ہی کی طرح کبھی صورت دکھا کر اور کبھی صورت چھپا کر انسان
چھیڑتا ہے۔

Marfat.com

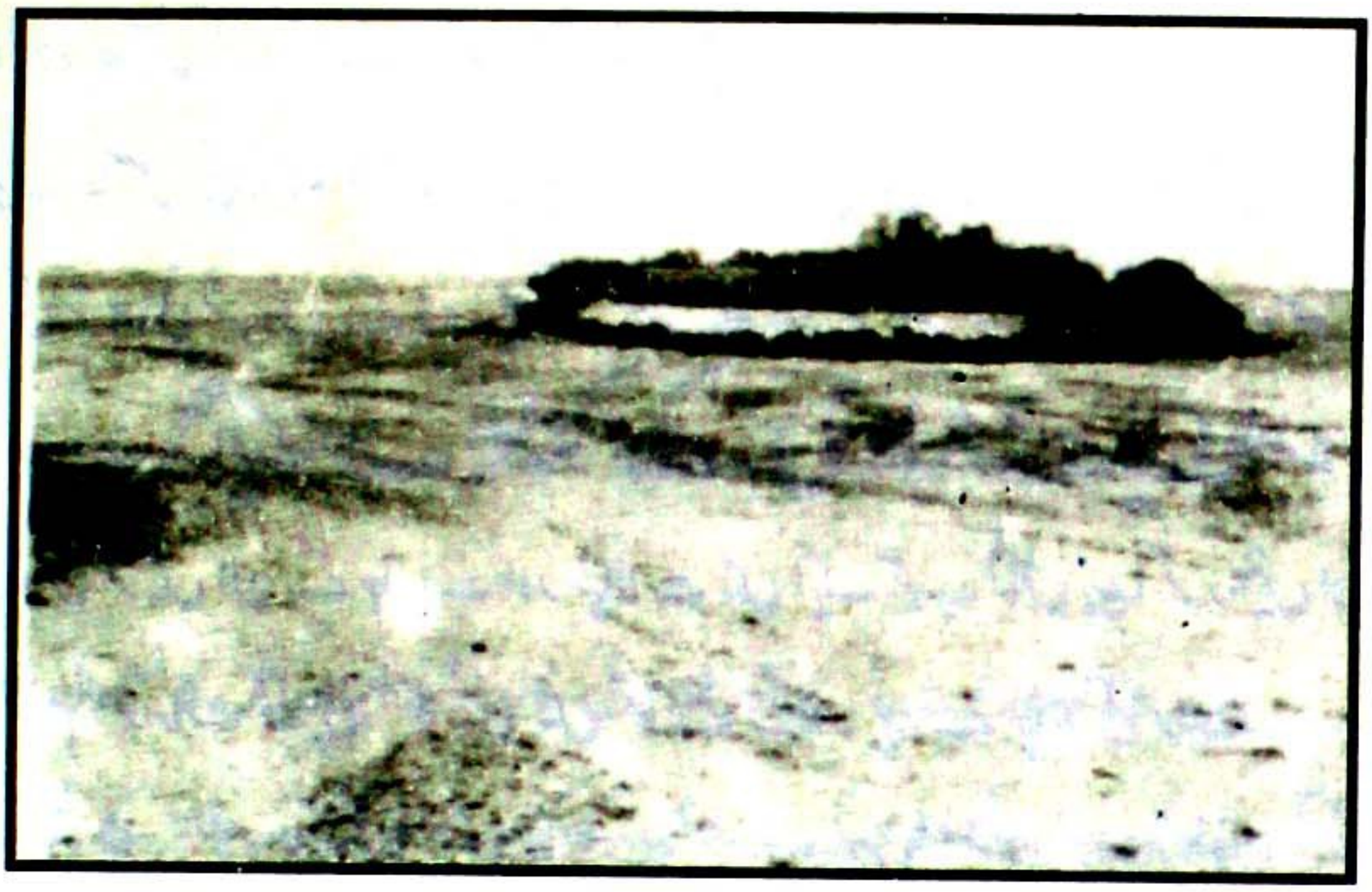

Banks of the Raavi river

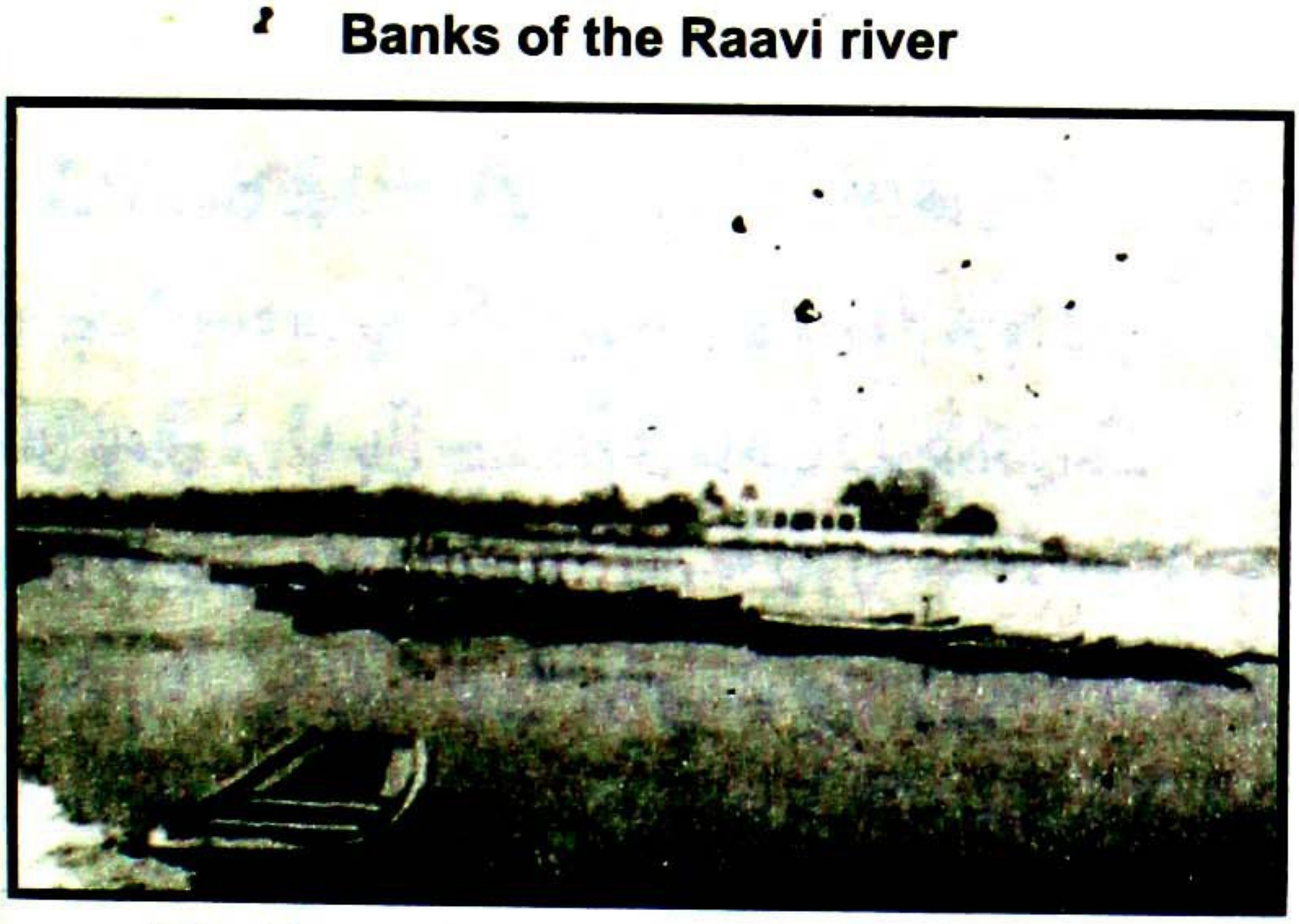

The Raavi river and Kamran's Baradari

کئی سال بعد جب غلام علی خان صاحب نے اپنا تیار کیا ہوا یہ گانا راگ

مالکونس میں ایک میوزک کانفرنس میں دہلی کے رام لیلا میدان میں سنایا تو حاضرین

صرف ان کی گائیکی پر ..... بلکہ ان کی خیال آفرینی پر بھی سحرزدہ ہو کر رہ گ

انہوں نے لفظوں کی ایسی دلکش بندش کے ساتھ ایسی خوبصورت آواز پہلے کبھی نہیں

تھی۔ لاہور میں جب موسیقی کے شائقین کو پتہ چلا کہ بڑے غلام علی خان صاحب ر

Marfat.com

کے کنارے بیٹھ کر رات کو ریاض کرتے ہیں تو وہ اس طرح وہاں جمع

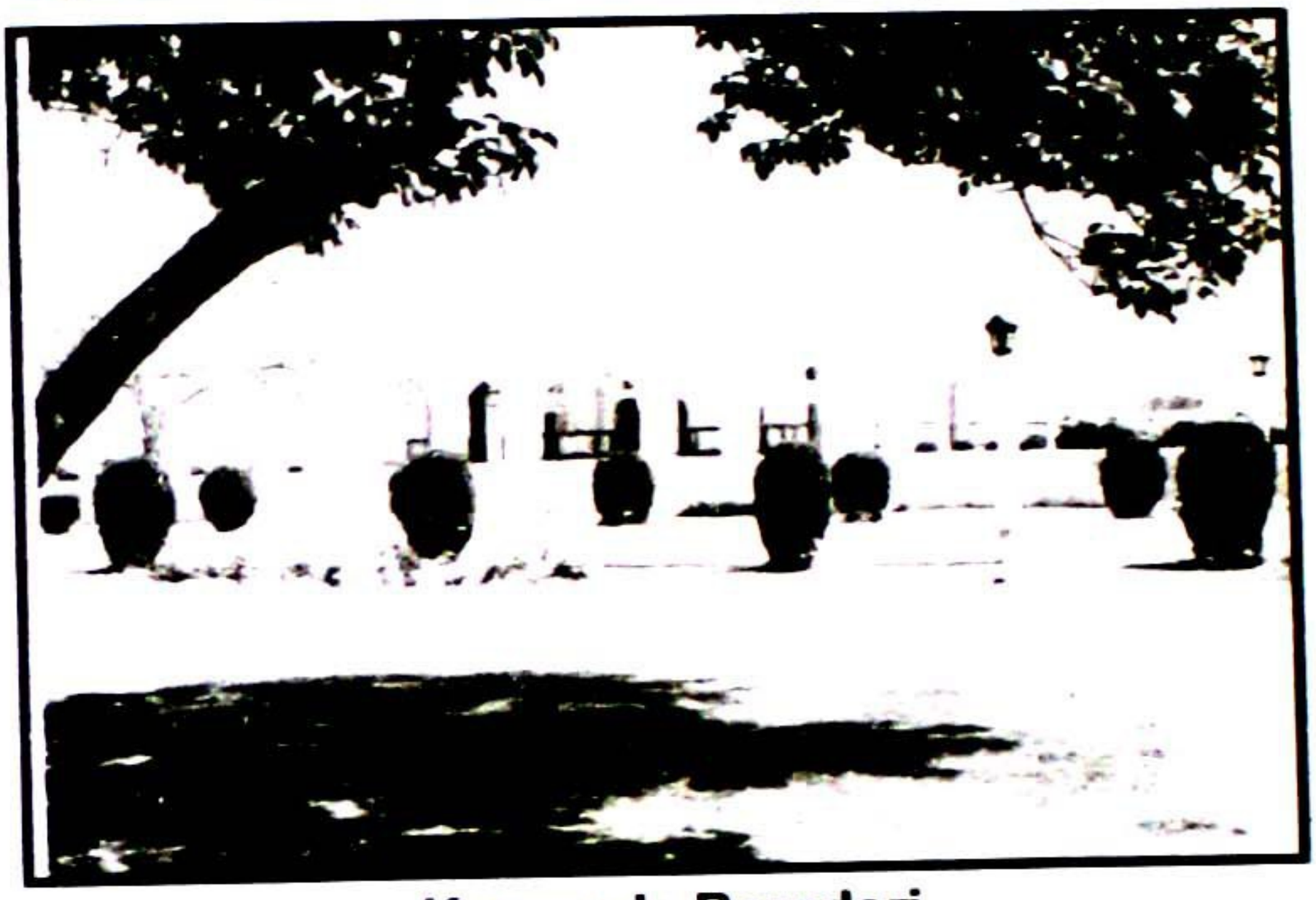

Kamran's Baradari

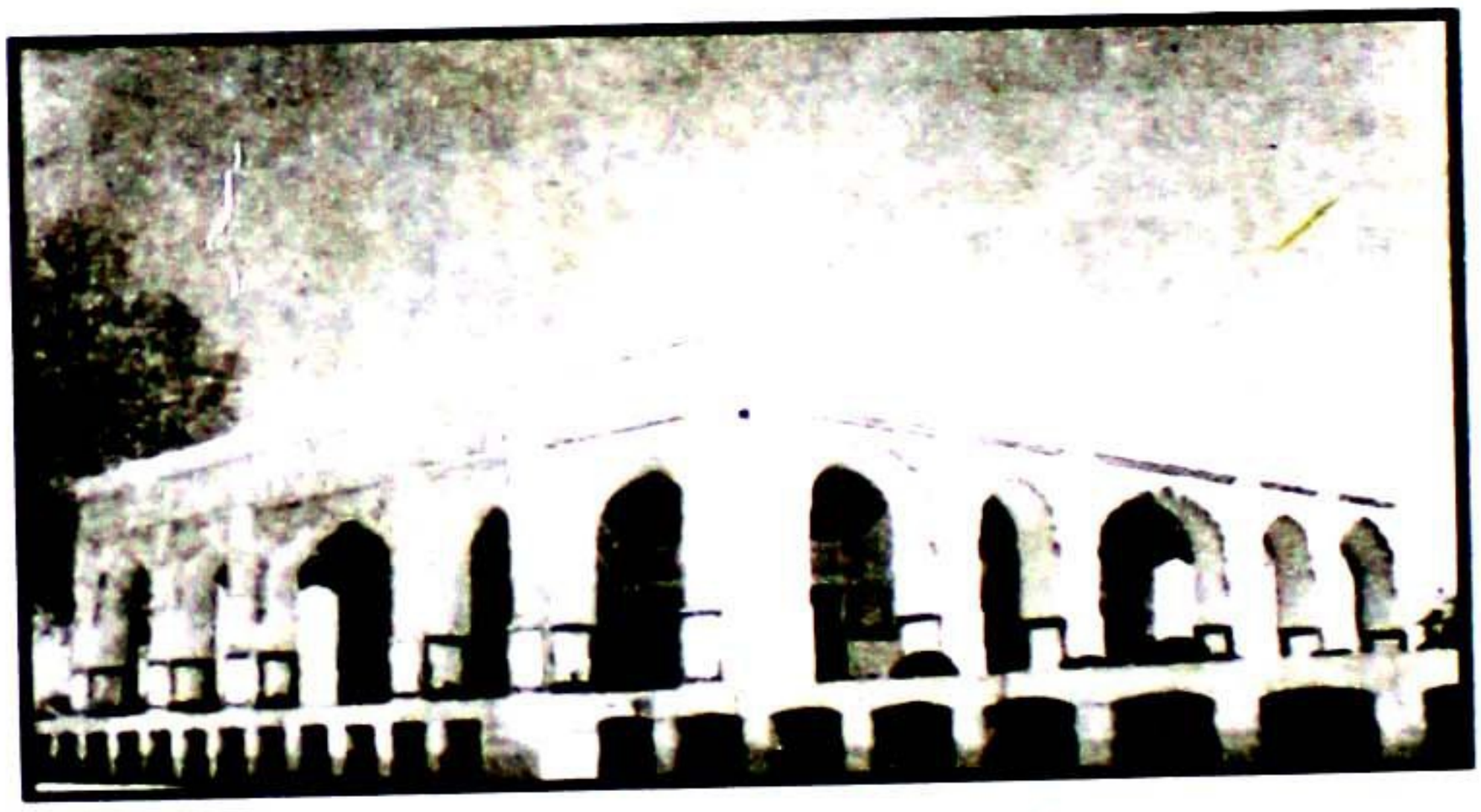

Kamran's Baradari

ہونے لگے جیسے شمع کے گرد پروانے۔ وہ آتے اور خاموشی سے ادھر ادھر' جس کو جہاں جگہ ملتی' بیٹھ جاتے۔ غلام علی خان صاحب کا یہ معمول برسوں جاری رہا اور رفتہ رفتہ وہ جگہ موسیقی کے عاشقوں' دیگر گانے والوں' سازندوں' سادھوؤں' فقیروں اور درویشوں کا گڑھ بن گئی۔ دن میں وہ جگہ ویرانہ ہوتی اور رات کو وہاں گویا ایک انوکھی دنیا آباد ہو جاتی اور ایک جہانِ حیرت کے در کھل جاتے۔ ان کے دوستوں اور شناساؤں میں بھی

Marfat.com

جو موسیقی کے رسیا تھے' وہ وہاں پہنچ جاتے اور ان کے گانوں پر سُر دھنتے۔ پیرس کے دریائے سین پر بھی کچھ اسی قسم کی روایتیں قائم ہوئی تھیں۔ غلام علی خان صاحب کی قیام گاہ پر بھی کچھ ایسا ہی سماں رہتا تھا۔ اس طرح کے فنکاروں کی قیام گاہ کو عموماً "تکیہ" کہا جاتا تھا۔ غلام علی خان صاحب کے تکیے پر شہر بھر کے فنکار' گویئے' موسیقار اور شاعر حاضری دیتے تھے۔ "تکیہ" ویسے تو صوفیانہ زبان میں' درویشوں کے آرام کرنے کی جگہ کو کہا جاتا تھا لیکن فنکاروں کی قیام گاہوں اور ان کی بیٹھک کے لئے بھی یہی لفظ استعمال ہونے لگا تھا۔ لاہور میں ایسے کتنے ہی تکیے تھے جن کی اپنی اپنی ایک تاریخی اہمیت تھی مگر وقت کے ساتھ ساتھ سب اجڑ گئے اور امتداد زمانہ کے باعث ان میں سے بیشتر کا نام ونشان تک نہیں رہا۔ دریائے راوی کا کنارہ بھی ایک طرح سے برسوں تک غلام علی خان صاحب کا تکیہ ہی رہا۔

بہت برسوں بعد انہوں نے میرے سامنے اس دور کی یاد تازہ کرتے ہوئے بتایا کہ دریا کے کنارے رات رات بھر ریاض کے اس معمول نے نہ صرف ان کی قوتِ کار ..... یا اسٹیمنا (STAMINA) کو بڑھایا بلکہ وہاں جمنے والی غیر رسمی محفلوں کی وجہ سے انہیں سامعین پر اپنی گائیکی کے اثرات کا جائزہ لینے کے معاملے میں بھی بہت تجربہ حاصل ہوا۔

1921ء میں یہ معمول اچانک ہی ختم ہو گیا۔ ہوا یہ کہ غلام علی صاحب کے والد پر فالج کا حملہ ہوا اور ان کے خاصے بڑے کنبے کی کفالت کی ذمہ داری غلام علی خان صاحب کے کندھوں پر آن پڑی۔ اس موقع پر قدرت نے ان کی مدد کی اور انہیں کنسرٹس یا موسیقی کی محفلوں میں گانے کی دعوتیں ملنے لگیں۔ اُس زمانے میں میڈیا تو آج کی طرح طاقتور نہیں تھا۔ فنکاروں کی شہرت زبانی ہی ایک سے دوسرے تک

Marfat.com

Ghulam Ali

پہنچتی تھی اور فنکاروں کو بھی ایک دوسرے ہی سے معلوم ہوتا تھا کہ ان کے فن کے قدردان کہاں ہیں؟ گانے والوں کی مقبولیت کا ایک بڑا ذریعہ گراموفون ریکارڈ تھے لیکن ان کے معاملے میں بھی مسئلہ یہ تھا کہ کلاسیکل گانوں کی ریکارڈ خریدنے والوں کی تعداد زیادہ نہیں تھی۔ ''استادوں'' کی سرپرستی تو فن شناس راجہ' مہاراجہ' نواب' امراء اور

Marfat.com

زمیندار ہی کر سکتے تھے۔ تاہم اُسی دور میں رفتہ رفتہ گراموفون ریکارڈ تیار کرنے والی بڑی بڑی کمپنیوں نے بھی شہرت کے حامل کلاسیکل گویّوں کے ریکارڈ نفع نقصان کی زیادہ پروا کئے بغیر کافی دھوم دھام سے تیار کرنا شروع کر دیے۔ اس سے ان کا مقصد درحقیقت اپنی ساکھ بہتر بنانا اور وقار میں اضافہ کرنا تھا۔ کمپنیاں یہ ثابت کرنا چاہتی تھیں کہ وہ بھی معیاری کام کی قدردان ہیں اور اس کی ترویج میں اپنے وسائل کے مطابق حصہ لے رہی ہیں۔

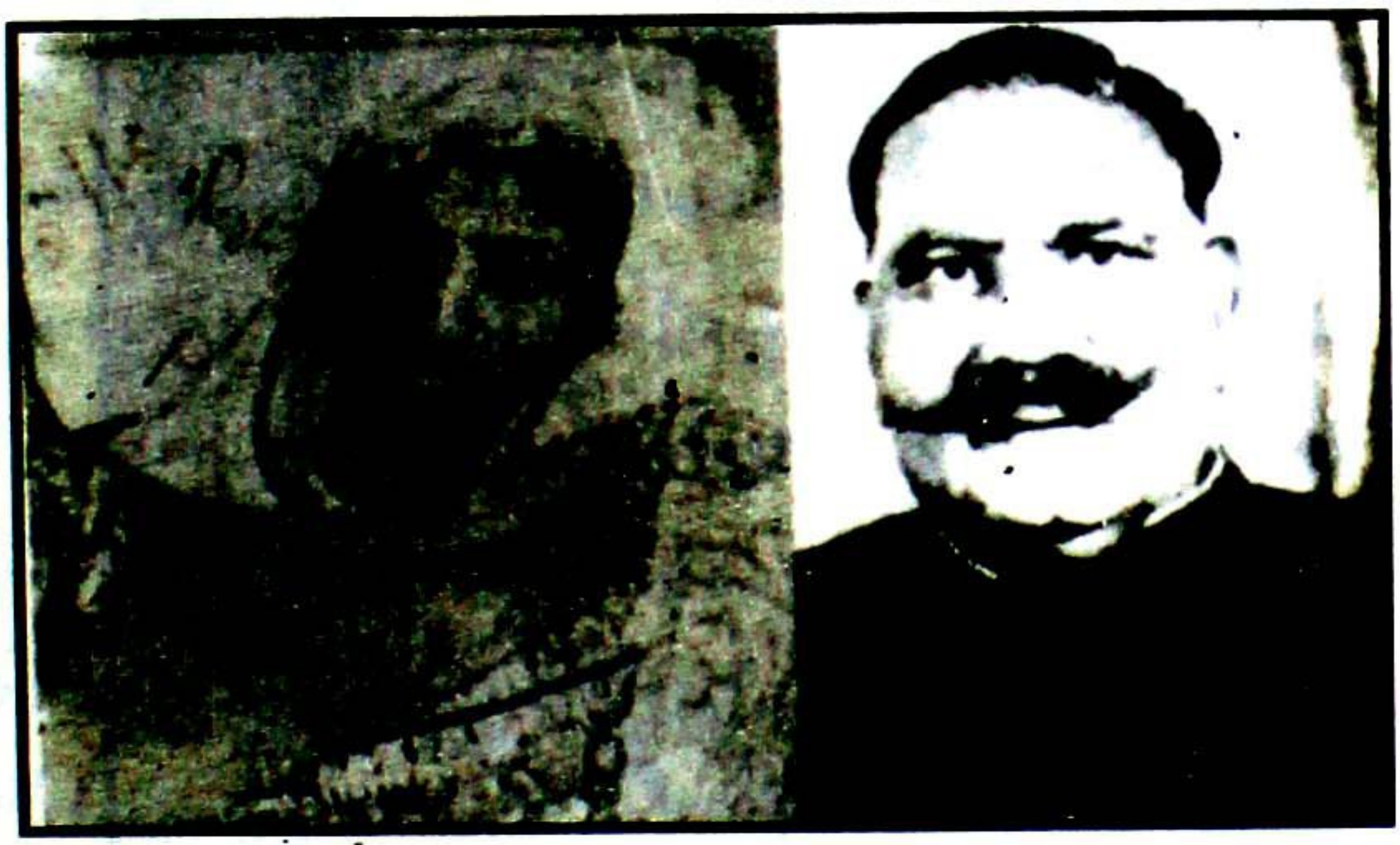

Marriage of Bade Ghulam Ali and Allah Jiwal

1920ء اور 1930ء کی دہائیوں میں موسیقی کے "استادوں" کے گھرانے محدود تعداد میں تھے۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ یہ گھرانے اپنا فن خاندان سے باہر منتقل نہیں کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اگر یہ سلسلہ شروع ہو گیا تو فن دور دور تک پھیلنے کے دوران میں اپنی خالص اور اصل شکل کھو بیٹھے گا۔ اس لئے وہ اپنے بیٹوں ..... یا زیادہ سے زیادہ خاندان کے افراد کو ہی گائیکی سکھاتے تھے۔ خاندان سے باہر کے لوگوں کو یہ فن نہیں سکھاتے تھے۔ ان میں خاندان سے باہر شادیاں بھی کرنے کا رواج

Marfat.com

نہیں تھا۔ رشتہ برادری میں ہی تلاش کیا جاتا تھا۔ یوں ایک خاندان کی گائیکی کا انداز تک اسی گھرانے میں محفوظ اور محدود رہتا تھا۔ یہ ایرانی اور ہندوستانی روایت ہے۔ زیادہ تر ان دو ملکوں میں ہی فن کا سلسلہ نسل در نسل چلا ہے۔ ساتھ ہی اس معاملے میں بھی خاندان کی یکجہتی مثالی نظر آتی تھی کہ اگر کسی کنبے کا سربراہ انتقال کر گیا اور پسماندگان کا کوئی ذریعہء معاش نہ رہا تو خاندان یا کنبے کا کوئی نہ کوئی دوسرا فرد آگے بڑھ کر یہ ذمے داریاں سنبھال لیتا تھا۔ آج کے نفسانفسی کے دور اور ''گردن کاٹ'' مقابلے کی فضا میں یہ یقین کرنا مشکل محسوس ہوتا ہے کہ ساٹھ ستر سال پہلے تک یہ روایتیں اپنی تمام تر تابانی کے ساتھ ہمارے معاشرے میں موجود تھیں۔

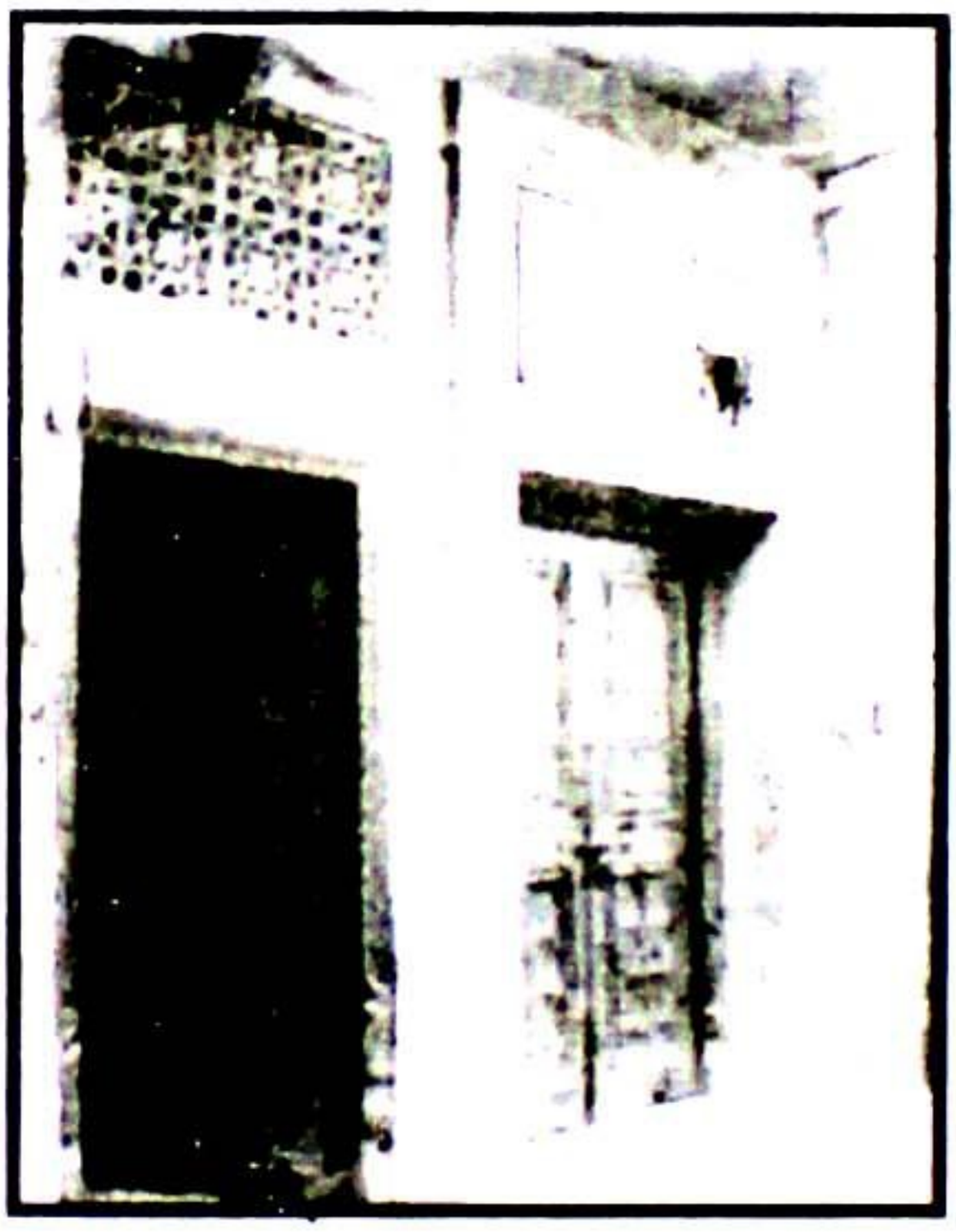

Front of Ghulam Ali's house in Koocha Kashmiriyan

Narrow lane in Koocha Kashmiriyan

غلام علی خان جیسے باصلاحیت فنکار کے لئے وہ مقام حاصل کرنا زیادہ دشوار نہیں تھا جس کے وہ مستحق تھے۔ نوجوانی کے اس دور میں ہی بہت کم عرصے میں ان کی شہرت دور دور تک پھیلنے لگی۔ جلد ہی وہ اپنے وقت کے کامیاب ترین گویے شمار ہونے

Marfat.com

لگے۔ پیسہ بھی انہوں نے خوب کمایا اور اسی طرح کھلے دل سے خرچ کیا وہ شاہانہ انداز میں رہتے تھے۔ ان کا فنی قد کاٹھ تو بڑا تھا ہی ..... لیکن ان کی شخصیت بھی اتنی نمایاں اور غیر معمولی تھی کہ وہ فنکاروں کے ہجوم میں بھی الگ ہی نظر آتے تھے۔

یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ انہیں ''بڑے'' غلام علی کیوں کہا جاتا ہے؟ درحقیقت ان کے دور میں غلام علی نام ہی کے ایک اور گویئے بھی موجود تھے۔ وہ نہ تو ان غلام علی صاحب جتنے مقبول یا معروف تھے جن کا ہم تذکرہ کر رہے ہیں اور نہ ہی شخصیت کے اعتبار سے ان کی طرح نمایاں تھے۔ چنانچہ وہ چھوٹے غلام علی خان کہلانے لگے تھے۔ یوں ہمارے متذکرہ غلام علی خان صاحب خود بہ خود ہی ''بڑے'' غلام علی خان ہو گئے۔ یہ لاحقہ زندگی بھر کے لئے ان کے نام کے ساتھ لگ گیا ..... اور یہ ان کے حق میں اچھا ہی ہوا۔ اس طرح ان کی شناخت کے معاملے میں کسی الجھن یا ابہام کا امکان نہیں رہا۔ کئی برس پہلے جب بڑے غلام علی خان صاحب کو پدرانہ شفقت' سرپرستی اور مالی اعتبار سے مدد کی ضرورت تھی تو وہ نہ جانے کن امیدوں کے ساتھ اپنے والد صاحب کے پاس گئے تھے لیکن انہوں نے اپنی دوسری بیوی اور اس سے ہونے والے اپنے بچوں کی وجہ سے غلام علی صاحب کو اپنے ساتھ نہیں رکھا تھا لیکن جب وہ فالج کی وجہ سے کسی قابل نہ رہے اور ان کی اہل خانہ کی گزر اوقات مشکل ہو گئی تو ان کی مکمل کفالت بڑے غلام علی خان صاحب نے اپنے ذمّے لے لی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ صرف فنی اور جسمانی لحاظ سے ہی بڑے نہیں تھے' ان کا دل بھی بہت بڑا تھا 1927ء میں بڑے غلام علی صاحب کی شادی ایک نوجوان اور خوبصورت لڑکی سے ہوئی جس کا نام اللہ جوائی تھا۔ وہ علی بخش صاحب کے ایک کزن بابا فتح دین کی بیٹی تھیں۔ بڑے غلام علی خان نے موچی دروازے کے کوچہ کشمیریاں میں ایک

Marfat.com

مکان خرید لیا تھا۔ نوجوان جوڑا اس میں رہنے لگا۔ 1929ء میں اللہ تعالیٰ نے انہیں ایک بیٹے سے نوازا۔ ان کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ انہوں نے اس کا نام کرامت علی رکھا۔ ڈیڑھ سال بعد ان کے ہاں ایک اور بیٹا ہوا جس کا نام انہوں نے منور علی رکھا۔ بڑے غلام علی صاحب کو خوش حالی' گھریلو اطمینان اور اولاد' سبھی کچھ حاصل تھا۔ انہیں ہر روز نت نئی کامیابیاں اور خوشیاں بھی نصیب ہو رہی تھیں۔ مستقبل تابناک نظر آ رہا تھا۔ ان تمام عوامل نے ان کے اعتماد میں بڑا اضافہ کر دیا تھا۔

موسیقی بڑے غلام علی صاحب کی زندگی تھی اور گانا ان کے لئے سانس لینے کی طرح تھا۔ راوی کے کنارے برسوں کے ریاض نے انہیں گویا بے مثال انداز میں تراشا گیا ایک ہیرا بنا دیا تھا اور اپنے فن میں یکتا کر دیا تھا۔ وہ گو کہ نوجوان ہی تھے لیکن انہیں سننے والے بڑے بڑے پرانے اساتذہ اور سخت دل نقاد بھی بے اختیار انہیں داد دینے پر مجبور ہو جاتے تھے۔ ان کے ہونٹوں سے بھی ''جیو ..... جیو.....'' واہ ..... واہ .....'' کی صدائیں بلند ہونے لگتی تھیں۔

اسی زمانے میں بڑے غلام علی خان صاحب کا پہلا گراموفون ریکارڈ تیار ہوا جو ساڑھے تین منٹ کا تھا۔ اس میں آپ نے راگ ملتانی میں خیال گایا تھا۔ اس وقت تک گراموفون متوسط طبقے کے گھروں میں پہنچ چکا تھا اور گراموفون کمپنی ''ہز ماسٹرز وائس'' کا نام ہر گھر میں جانا پہچانا جانے لگا تھا۔ اس ریکارڈ کے دوسری طرف بڑے غلام علی خان صاحب کی ایک ٹھمری تھی جس کے بول تھے:

مورے نین لاگے ان سے
جیا چاہے جو کرے

Marfat.com

Bazaar in Koocha Kashmiriyan in Lahore

Singer Noor Jehan becoming a disciple of Bade Ghulam Ali Khan Sahib, Lahore

بیسویں صدی کے ابتدائی تیس برسوں میں ہندوستان میں کلاسیکی موسیقی کے میدان میں بڑی تیزی سے پیش رفت ہوئی۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ اس سے پہلے انگریزوں نے شعوری کوششوں سے اپنے حاکمانہ وسائل کو استعمال کرتے ہوئے کلاسیکل میوزک کو دبا دیا تھا۔ خالص انگریزوں اور انگریزی مزاج رکھنے والے بعض ہندوستانیوں

Marfat.com

کا بھی خیال تھا کہ کلاسیکی موسیقی محض ایک علاقائی سی چیز ہے اور اس میں ''روں روں'' کے علاوہ رکھا ہی کیا ہے! فن سے بالکل ہی ناآشنا لوگ ..... جنہیں کلاسیکی موسیقی ذرا بھی سمجھ میں نہیں آتی' وہ آج بھی یہی کہتے ہیں۔ انگریزوں نے اپنے دور حکومت میں کلاسیکی موسیقی کی مقبولیت کو مزید کم کرنے اور اس کے مقابلے میں اپنی موسیقی اور ثقافت کو اُبھارنے کے لئے جگہ جگہ سرکاری پارکوں میں ''بینڈ اسٹینڈ'' کھڑے کر دیے تھے جہاں ایک وقت میں تیس تیس سازندے انگریزی دھنیں الاپتے اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے قصیدے بھی گاتے۔ ممبئی میں باندرہ کے علاقے میں ..... اور انڈیا کے بعض دوسرے شہروں میں آج بھی پارکوں میں بینڈ اسٹینڈ نظر آتے ہیں یہ اسی دور کی یادگار ہیں۔ اس دور میں کلاسیکی موسیقی کو درحقیقت نیم کلاسیکی گانے والی طوائفوں اور گلوکاراؤں نے زندہ رکھا جن کے گانے' نسبتاً سادہ ہونے کی وجہ سے زیادہ مقبول تھے اور جن کے پرستاروں اور چاہنے والوں کی بڑی تعداد ملک کے طول و عرض میں موجود تھی تاہم اس دور میں بھی کلاسیکل گانے والوں نے حوصلہ نہیں ہارا۔ اساتذہ نے بھی اپنے فن کے میدان میں محنت جاری رکھی ..... اور پھر بات یہ بھی تھی کہ کلاسیکی موسیقی اتنی آسانی سے ختم ہونے والی چیز بھی نہیں تھی کیونکہ اس کی جڑیں فطرت کے اپنے وجود میں پیوست ہیں۔ چنانچہ تیس پینتیس برس تک موسیقی کا افق دھندلایا رہنے کے بعد ایک بار پھر روشن ہوا۔ مہاراشٹر میں لوگوں میں ازخود بھی موسیقی سے محبت موجود تھی اور پھر وہاں استاد رجب علی خان' عبدالکریم خان صاحب' میاں جان خان صاحب جیسے ماہرین فن بھی سکونت پذیر ہو چکے تھے۔ اس لئے وہاں ثقافتی ترقی کے ساتھ ساتھ کلاسیکی موسیقی کو بھی نئی زندگی ملی۔ کلاسیکی موسیقی کے احیاء میں پنڈت وشنو دی گمبر پلو شکر کا کردار بھی نہایت اہم ہے۔ انہوں نے کلاسیکل موسیقی کو باعزت مقام دلانے اور

Marfat.com

اس کے وقار میں اضافہ کرنے کے ضمن میں نا قابل فراموش خدمات انجام دیں۔ جیسا کہ پہلے بھی بیان کیا جا چکا ہے' انہوں نے کلاسیکی موسیقی کی تربیت اور ترویج کے لئے لاہور میں 1901ء میں بہت بڑا ادارہ قائم کیا تھا۔ فن موسیقی کے میدان میں وہ وجدانی صلاحیتوں کے مالک سمجھے جاتے تھے۔

لاہور میں غلام علی کے والد علی بخش خان اور کالے خان کا بڑا نام تھا اور انہیں اپنے ''قصوری'' ورثے پر بڑا ناز تھا تاہم اپنے نام کی عزت و وقار میں اضافہ کرنے کے لئے وہ پٹیالہ دربار کی مشہور جوڑی علی بخش (یہ دوسرے علی بخش تھے) اور فتح علی خان صاحب کے شاگرد بھی بن گئے تھے۔ اس جوڑی کو موسیقی کے میدان کے ''کرنیل'' اور ''جرنیل'' کے لقب سے بھی یاد کیا جاتا تھا۔ ان کے علاوہ پنجاب میں استاد پیارے علی خان' استاد امیر علی خان اور چھوٹے غلام علی جیسے پائے کے فنکار بھی موجود تھے۔

لاہور میں بعض اعلیٰ درجے کی طوائفیں بھی موجود تھیں جنہوں نے گائیکی میں بڑا نام پیدا کیا تھا اور جن کے بڑے بڑے قدردان اور مداح موجود تھے۔ انہیں بے پناہ مقولیت بھی حاصل تھی۔ ان میں چند نمایاں نام لاہور کی گلزار بائی' جموں کی ملکہ پکھراج' امراؤ جان بیگم' مختار بیگم' مختار بیگم اور شمشاد بیگم کے تھے۔ ان کے بعد اس فہرست میں فریدہ خانم اور نور جہاں کے نام بھی شامل ہو گئے تھے۔ نور جہاں تو لاہور میں بننے والی کئی فلموں کی ہیروئن بھی تھیں۔

تاریخی شہر دہلی کے موسیقی کے افق پر بے شمار نام ستاروں کی طرح جھلملاتے ہیں۔ ایک طویل عرصے تک وہاں بادشاہوں' ملکاؤں اور امرا نے گویوں اور موسیقاروں کی سرپرستی کی۔ ''دلی گھرانے'' کا سلسلہ بہت پیچھے جا کر حضرت امیر خسرو سے ملتا ہے جن کی بامعنی اور پر مغز شاعری کے علاوہ موسیقی کے میدان میں خدمات بھی ناقابلِ

Marfat.com

فراموش ہیں۔ چودھویں صدی کے اس عظیم صوفی شاعر اور موسیقار کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انہوں نے موسیقی کی قدیم ہندوستانی تھیوری ''سرسوتی دنیا'' میں اضافے اور ترامیم کیں۔ ستار ایجاد کیا جس کا استعمال آسان تھا اور اسے نازک راگوں کے ساتھ اپنے میں زیادہ عمدگی سے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے قدیم طبلے کو' جسے پکھاوج کہا جاتا تھا ..... اور جو دونوں طرف سے بجتا تھا' دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ انہیں ''طوطی ء ہند'' کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ ان کی بیشتر شاعری اس دور کی مروجہ ہندوستانی زبان میں ہے لیکن وہ فارسی کے بھی نہایت قابلِ تکریم شاعر تھے۔ ان کے گیت' صدیوں بعد' آج بھی مقبول ہیں اور گلی گلی گائے جاتے ہیں۔ انیسویں صدی میں دلّی گھرانے کے خلیفہ میاں اچھپل خان صاحب تھے۔ یہاں خلیفہ سے مراد مسلمانوں کے عظیم حکمران نہیں ..... بلکہ اس لفظ کو درحقیقت بہت ہی بڑے استاد کے معنوں میں استعمال کیا جاتا تھا۔ میاں اچھپل خان' بہادر شاہ ظفر کے بھی استاد تھے۔ اس آخری مغل حکمراں کو 1850ء میں انگریزوں نے جس طرح معزول کیا اور ان کے ساتھ جو سلوک کیا' اس دلخراش داستان سے آپ واقف ہی ہوں گے۔ شہنشاہ نے دریا گنج کے عقب میں موسیقاروں اور گویّوں کو زمین دی تھی جہاں ''سوئی والاں'' کے نام سے ان کی بستی آباد تھی۔ آج بھی وہاں بہت سے موسیقار' گویّے اور ان کے خاندان آباد ہیں۔ 1930ء میں بھی دلّی گھرانے میں بڑے بڑے نام جگمگا رہے تھے۔ مثلاً استاد امراؤ خان' استاد چاند خان' استاد نصیر احمد خان وغیرہ۔ آج کل اس قدیم دلّی گھرانے کے خلیفہ استاد اقبال احمد خان ہیں۔

دہلی کی شمشاد بائی ایک بہت ہی مشہور گانے والی تھی۔ گانے کے علاوہ اس کی پرکشش' دلکش حشر ساماں شخصیت بھی باعث شہرت تھی۔ اس کے ہاں موسیقی کی محفلوں

Marfat.com

میں نامی گرامی شعراء، شہزادے اور نواب آتے تھے۔ اس کا گانے کا انداز منفرد تھا۔ اس کے علاوہ آرارائش و زیبائش اور پہناوے کے انداز کی وجہ سے وہ ''چھمک چھلو'' کی عرفیت سے مشہور تھی لیکن اس زمانے میں اس عرفیت کا تاثر اس طرح استہزائیہ نہیں تھا۔ جس طرح آج کل ہے۔ اس دور میں ''چھمک چھلو'' کا خطاب اس خاتون کو دیا جاتا تھا جو غیر معمولی طور پر رنگا رنگ شخصیت کی مالک اور خوب بن سنور کر رہنے کی عادی ہوتی تھی۔ شمشاد بائی کے بارے میں مشہور ہے کہ لارنس آف عریبیہ بھی جب ہندوستان سے گزرتا تھا تو اس کے کوٹھے پر آتا تھا۔

2nd Row - L to R Bahadur Ali,
2nd Ghulam Ali Khan, Ustad Ashiq Ali and
Mukhtar Begum sitting - in the middle step
Mubarak Ali, younger brother of Ghulam Ali

Marfat.com

رامپور ریاست میں ''سہاسوان'' گھرانے کا طوطی بول رہا تھا۔ کلاسیکل موسیقی اور رقص وہاں کی معاشرت کا اہم حصہ تھا۔ رامپور کے نواب موسیقی کے بہت بڑے سرپرست تھے اور ان میں سے بہت سے خود موسیقی میں دخل رکھتے تھے۔ رامپور کی آنجہانی راج ماتا کا کہنا تھا کہ ان کے شوہر رضا علی خان پاؤں میں گھنگرو باندھ کر کتھک ڈانس کیا کرتے تھے اور وہ اتنے ماہر رقص اور موسیقار تھے کہ کسی بڑے استاد ان کے شاگرد بن گئے تھے۔ انہوں نے موسیقی کا ایک شعبہ بھی قائم کیا تھا جہاں موسیقار اور اور رقاص تربیت پاتے تھے۔ انہیں باقاعدگی سے وظیفہ دیا جاتا تھا تاکہ وہ معاشی پریشانی سے آزاد رہتے ہوئے فن پر توجہ دے سکیں۔ یہیں اپنے دور کے بہت بڑے طبلہ نواز احمد جان تھرکوا بھی موجود تھے۔ اختری بائی فیض آبادی بھی یہیں تھیں جو بعد میں بیگم اختر کہلانے لگی تھیں۔

Ghulam Ali Khan Sahib and Noor Jehan

ممتاز بین کار وزیر خان صاحب کا تعلق بھی ریاست رامپور سے تھا۔ ان کے شاگرد علاؤالدین خان بعد میں صوبہ بہار کے ایک چھوٹے سے گاؤں میہر میں سکونت

Marfat.com

پذیر ہو گئے تھے۔ وہ علی اکبر خان کے استاد اور والد جبکہ پنڈت روی شنکر کے سسر تھے۔ علاؤالدین خان بہت مشکل پسند فنکار تھے۔ اس کے باوجود ان کے بہت سے شاگرد تھے جن میں سرود بجانے والی مشہور خاتون شرن رانی ماتھر بھی شامل تھیں۔ انہوں نے خود اپنی بیٹی انا پورنا دیوی کو بھی ستار بجانا سکھایا جنہوں نے اس میں کمال حاصل کیا۔ آج کے بہت سے مشہور ستار نواز' انا پورنا دیوی کے شاگرد ہیں جن میں ہری پرشاد چوراسیہ بھی شامل ہیں۔

آگرہ میں استاد فیاض خان جیسا قد آور فنکار موجود تھا۔ انہوں نے دھرپد الاپ اور خیال رنگ کو ملا کر گانے کا طریقہ متعارف کرایا تھا۔ شمالی ہندوستان میں ایک طویل عرصہ تک گائیکی کے میدان میں ان کے نام کا ڈنکا بجتا رہا۔ انہیں بہت سے ایوارڈز اور میڈلز ملے۔ بعد میں استاد لطافت خان' استاد خادم حسین اور استاد ولایت حسین نے اس گھرانے کا نام اونچا کیا۔ لکھنؤ میں رقص' موسیقی اور دیگر فنون لطیفہ کی روایت بہت پرانی ہے۔ نوابوں اور اودھ کے حکمرانوں نے ان فنون کی بہت سرپرستی کی۔ اودھ کے آخری حکمران واجد علی شاہ خود بڑے ماہر موسیقار تھے۔ انہیں ٹھمری اور دادرا گانے میں خصوصی مہارت حاصل تھی۔ انگریزوں نے انہیں ان کے دربار سمیت جلا وطن کر کے 1856ء میں کلکتہ بھیج دیا تھا۔ انہوں نے وہاں مٹیا برج میں گویا ایک نیا' چھوٹا سا لکھنؤ آباد کر لیا۔ یہ لکھنؤ ان کے محل میں تھا جس کا نام انہوں نے ''رادھا منزل'' رکھا تھا۔ بنگال میں یہ رقص و موسیقی کا مرکز بن گیا۔ ایک روز ایک انگریز افسر معزول بادشاہ سے ملنے آیا اور ان سے پوچھا کہ ان کے ..... اور ان کی زیر کفالت افراد اور عملے وغیرہ کے لئے کتنا وظیفہ کافی رہے گا؟ شاہ واجد علی شاہ نے تحمل سے انگریز

Marfat.com

افسر کو بیٹھنے کا اشارا کیا۔ ان کے حکم پر ایک چاندنی پر ''گلال'' بکھیر دیا گیا۔ یہ ایک طرح کا سرخ پاؤڈر ہوتا تھا۔ جو باریک مٹی سے مشابہ ہوتا تھا۔ اس چاندنی پر ایک اور چاندنی بچھائی گئی۔ اس پر واجد علی شاہ نے نہایت مہارت سے کچھ دیر کتھک رقص کیا اور واپس اپنی نشست پر آ بیٹھے۔ جب اوپر والی چاندنی اٹھائی گئی تو اس پر سرخ رنگ صرف اس انداز میں ..... اور اس حد' تک لگا تھا کہ رام کرشنا کی شبیہہ بن گئی تھی۔ انگریز افسر دم بہ خود رہ گیا۔ واجد شاہ نے کہا ''میں ایک فنکار ہوں۔ تم میرے فن کو پیسوں میں تولنے آئے ہو؟ تم نے میرا سب کچھ چھین لیا لیکن میرا فن مجھ سے نہیں چھین سکتے۔ میں تم سے بھیک نہیں مانگوں گا۔'' لکھنؤ میں اودھ کے دو تعلقہ داروں راجہ نواب علی اور رائے راجیشور بالی نے ایک میوزک کالج قائم کیا تھا جس کا نام اتر پردیش کے اس وقت کے انگریز گورنر کے نام پر ''میرس کالج آف ہندوستانی میوزک'' رکھا تھا۔ آزادی کے بعد اس کالج کا نام ''بھات کھانڈے یونیورسٹی آف ہندوستانی شاستریہ سنگیت'' رکھ دیا گیا۔

لکھنؤ ان دنوں نارتھ انڈیا میں فن و ثقافت کا سب سے بڑا مرکز اور سلطنت اودھ کی ثقافتی قدروں کا امین تھا جس پر لکھنؤ کو آج بھی فخر ہے۔ متذکرہ بالا کالج میں اپنے وقت کے بڑے بڑے ماہرین فن اساتذہ خدمات انجام دے چکے ہیں۔ بیسویں صدی کے وسط تک کا انڈیا کا منظر نامہ موسیقی کے حوالے سے مختصراً بیان کیا گیا۔

.....☆.....

Marfat.com

نوجوانی میں صدمہ

نوجوان غلام علی کو اپنی محبت کرنے والی بیوی کی رفاقت زیادہ طویل عرصے کے لئے نصیب نہیں ہوسکی۔ اللہ جوائی اچانک بیمار ہوئی اور تھوڑا ہی عرصہ علیل رہنے کے بعد 1932ء میں انتقال کر گئی۔ غلام علی خان کے بیٹے منور علی اس وقت بہ مشکل دو سال کے اور کرامت علی چار سال کے تھے۔ جوان بیوی کا انتقال خود غلام علی خان کے لئے بھی ایک بڑا سانحہ تھا۔ کیونکہ وہ اپنی بیوی سے بہت محبت کرتے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ کمسن بچوں کے سر سے ماں کا سایہ اٹھ جانا بھی ایک المناک واقعہ اور سماجی مسئلہ تھا۔ مرحومہ اپنے شوہر کو پیار سے ''لالہ'' کہہ کر پکارتی تھیں۔ گوکہ ان کی ازداوجی رفاقت کا عرصہ صرف پانچ سال پر محیط تھا لیکن غلام علی خان مرتے دم تک اپنی بیوی کا تذکرہ والہانہ انداز سے کرتے رہے۔ اپنی زندگی کے اس خلا کو پُر کرنے اور سماجی مجبوریوں کا مداوا کرنے کے لئے گوکہ چند سالوں بعد انہوں نے دوسری شادی کر لی تھی لیکن ان کی باتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ اپنی آخری سانس تک وہ پہلی بیوی کو بھول نہیں پائے۔

رنج وغم کے اس دور میں زخم دل کی اذیت ذرا کم ہوتے ہی غلام علی خان نے ایک بار پھر موسیقی کا رخ کیا کیونکہ موسیقی میں ہی ان کے لئے پناہ تھی اور موسیقی

Marfat.com

ہی ان کے دکھوں کا مداوا تھی۔ ایک روز انہوں نے سُر منڈلی اٹھایا اور اس کے تاروں کو چھیڑا۔ خود بہ خود ایک دُھن ترتیب پانے لگی۔ انہوں نے اس دھن کو الفاظ دینے کی کوشش تو بول کچھ یوں بنے:

یاد پیا کی آئے
یہ دکھ سہا نہیں جائے
ہائے رام .....

یہ گانا اور اس کی موسیقی انہوں نے گویا بے خیالی کے سے عالم میں ترتیب دی تھی لیکن یہ ان کی نہایت مقبول ٹھمریوں میں شمار ہوا۔ شاید اس لئے کہ یہ ان کے اپنے دکھے ہوئے دل کی گہرائیوں سے ابھرا تھا۔ راوی کنارے انہوں نے راتوں کو برسوں جو ریاض کیا تھا' اس نے راگوں کے بارے میں ان کی روح کو جس قدر حساس بنا دیا تھا اور ان کی آواز کو جس طرح نکھارا تھا' اس میں اپنے درد دل کی آمیزش ہونے کے بعد اس کی خوبصورتی' کشش اور رگداز گویا مزید بڑھ گیا۔ وہ اب ہر احساس کو پہلے سے بھی زیادہ خوبصورتی کے ساتھ اپنی گائیکی میں سمونے پر قادر ہو چکے تھے۔ ان کی اسی زمانے کی ایک اور ٹھمری بے حد مشہور ہوئی:

آئے نا بالم' کا کروں سجن
رووت رووت کل نا پڑت ہے
یاد آوت جب ان کی بتیاں

اس دور میں خاندان کے اکٹھا رہنے کے رواج نے غلام علی خان صاحب کو سہارا دیا۔ ماں کے سائے سے محروم ہونے کے بعد ان کے کمسن بچے ان کی سوتیلی بہن

Marfat.com

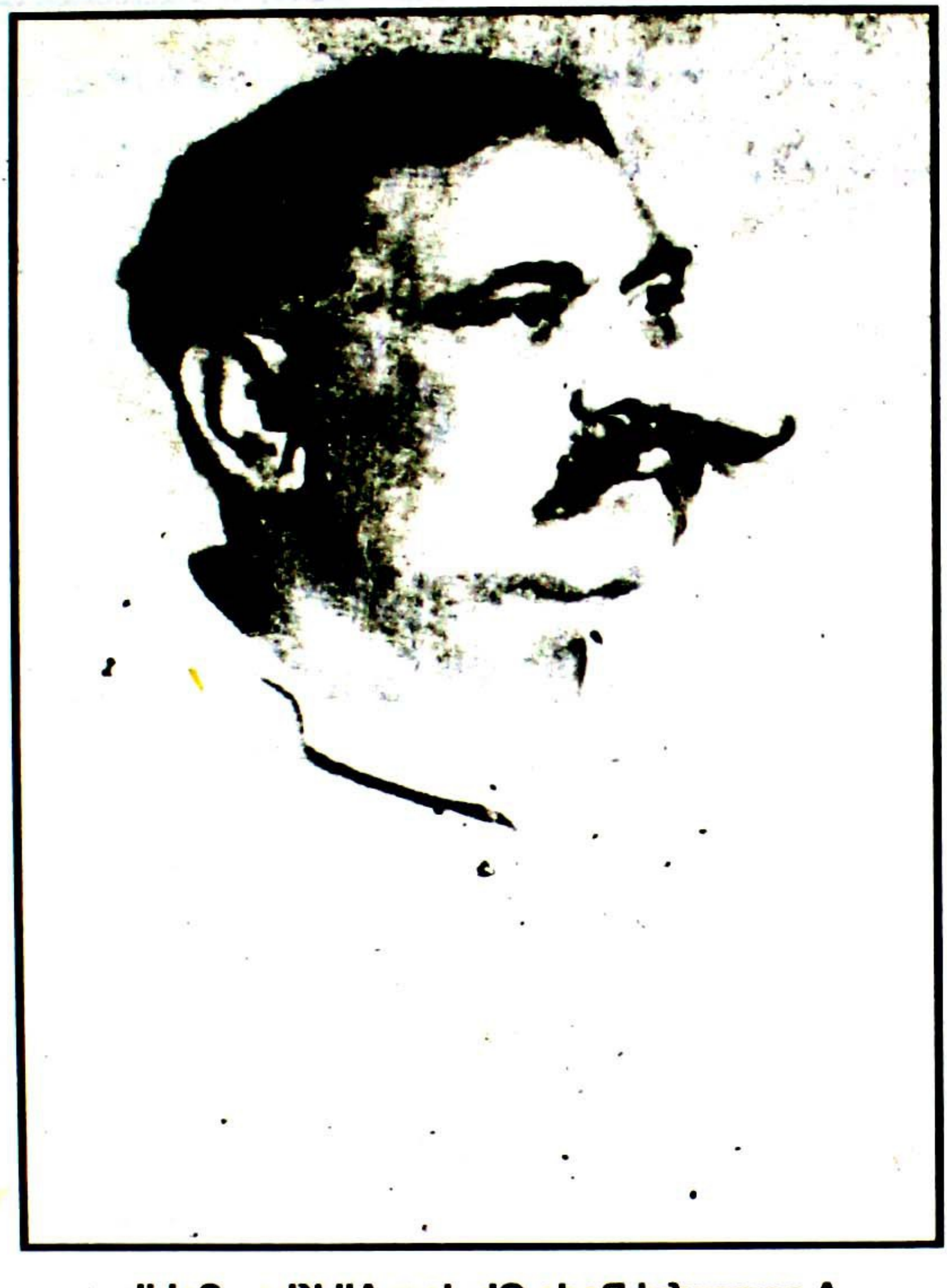

A sorrowful Bade Ghulam Ali Khan Sahib
with his beloved Sur Mandal

پون کے پاس پرورش پانے لگے وہ اپنے پھوپھی زاد بھائی بہنوں کے ساتھ کھیل کود کر ہنسی خوشی دن گزارتے ہوئے بڑے ہونے لگے۔ اسی طمانیت کی وجہ سے غلام علی خاں صاحب کے لئے بے فکری سے اپنے کیریئر کی طرف توجہ دینا ممکن ہوا۔ ان کی شہرت اور مقبولیت میں روز بہ روز اضافہ ہو رہا تھا۔ انہیں کنسرٹس میں شرکت کے لئے کئی کئی روز کے لئے گھر

Marfat.com

سے دور باہر جانا پڑتا تھا۔ تاہم انہیں اطمینان تھا کہ ان کی غیر موجودگی میں بھی ان کے بچوں کی دیکھ بھال عمدگی سے ہو رہی ہے انہوں نے چونکہ خود اپنا بچپن غربت اور مشکلات میں گزارا تھا۔ شاید اس لئے ان میں یہ خواہش زیادہ شدید تھی کہ ان کے بچے آرام و آسائش کی زندگی بسر کریں اور اچھی تعلیم حاصل کریں۔

غلام علی خان صاحب ہمیشہ موسیقی کی محفلوں میں شرکت کے لئے دوسرے شہروں کے سفر پر روانہ ہوتے وقت اپنے سازندے اپنے ساتھ لے کر جاتے تھے سازندوں کے علاوہ جو چیز ساتھ لے جانے کا خاص خیال رکھتے تھے' وہ خالص اور دیسی گھی تھا۔ کھرے گھی کا ایک کنستر وہ اپنے ساتھ لے کر روانہ ہوتے تھے۔ یہ کھرا دیسی گھی اس زمانے میں ایک روپے سیر ملتا تھا اور کنستر سولہ سیر کا ہوتا تھا۔ قصور کے دیسی گھی کے سوا خان صاحب کا کہیں اور کے گھی پر اعتماد نہیں تھا۔ انہیں اندیشہ رہتا تھا کہ کہیں اور گھی اُن کا گلا خراب نہ کر دے۔ ان کے خیال میں صرف قصور کا گھی ان کے گلے کی حفاظت کرتا تھا اور اسے صحیح حالت میں رکھتا تھا۔ چنانچہ جہاں گھی کا کنستر ختم ہونے لگتا' خان صاحب موسیقی کی باقی محفلیں چھوڑ چھاڑ کر واپس روانہ ہو جاتے۔

ان کے طبلہ نواز عبداللہ خان ان کے شاگرد ہونے کے ساتھ ساتھ ان کے قریبی ساتھی اور معتمد تھے۔ ان کا حافظہ بہت اچھا تھا۔ استاد جو بھی بندشیں گاتے' وہ اگر عارضی طور پر ان میں سے کوئی بھول بھی جاتے تو عبداللہ خان صاحب اسے درستگی کے ساتھ یاد رکھتے۔ ابتداء میں موسیقی کی محفلوں کے لئے خان صاحب کو بلاوے آس پاس کے شہروں اور قصبوں سے آتے تھے لیکن جوں جوں ان کی شہرت پھیلتی گئی' انہیں دور دور سے بلاوے آنے لگے۔ ان دنوں تقاریب کے لئے بڑے بڑے آڈیٹوریم وغیرہ تو تھے

Marfat.com

نہیں ..... موسیقی کی محفلیں زیادہ تر امراء' صاحب حیثیت اور صاحب ذوق افراد کے گھروں پر ہی منعقد ہوتی تھیں۔ غلام علی خان صاحب ان محفلوں میں اپنی گائیکی سے سماں باندھ دیتے۔ بوڑھے' جوان' سبھی ان کی گائیکی کے سحر میں کھو جاتے اور دم بہ خود ہو کر انہیں سنتے۔ وہ سننے والوں کے موڈ کو بھی اچھی طرح سمجھتے تھے اور وقت' موسم' موقع محل کی نزاکتوں کا بھی پورا خیال رکھتے تھے۔

گھر واپس آنا ان کے لئے ایک خوش کن موقع ہوتا تھا۔ جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکی ہوں' خان صاحب کا صرف فنی قد کاٹھ ہی بڑا نہیں تھا' وہ سچ مچ جسمانی طور پر بھی ایک قد آور اور بارعب آدمی تھے لیکن اس سے بھی زیادہ بڑا ان کا دل تھا۔ وہ جو کچھ بھی کما کر لاتے' اپنے دوستوں اور ساتھیوں میں فراخ دلی سے بانٹتے۔ اپنے اور بہن کے بچوں کے لئے قیمتی تحفے لاتے۔ ان کے آنے کی خبر سن کر ضرورت مندوں کا بھی ان کے گھر پہ تانتا بندھ جاتا اور وہ پوری پوری کوشش کرتے کہ کسی کو بھی مایوس نہ لوٹائیں۔ ان میں کوئی قرض دار ہوتا' کسی کو بیٹی کی شادی کا مسئلہ درپیش ہوتا یا کسی اور مقصد کے لئے رقم کی ضرورت ہوتی۔ خان صاحب ہر ایک کے کام آتے' ہر ایک کی حاجت روائی کی کوشش کرتے۔ اس ضمن میں وہ یہ بھی خیال رکھتے کہ لوگوں کی مدد خاموشی سے کریں تا کہ ان کی انا مجروح نہ ہو اور جاننے والوں میں ان کی سبکی نہ ہو۔

خان صاحب کو یقین ہوتا تھا کہ جب ان کی جیبیں خالی ہوں گی تو اللہ تعالیٰ انہیں ایک بار پھر بھر دیں گے۔ میں نے اس کے کافی برسوں بعد ان کی دوسری بیوی اماں اللہ رکھی کو اکثر کہتے سنا " خان صاحب! جب آپ کی جیب میں پیسے ہوتے ہیں تو کیا وہ آپ کو بوجھ محسوس ہوتے ہیں جو آپ کو ان سے چھٹکارا پانے کی اتنی جلدی

Marfat.com

رہتی ہے"؟

خان صاحب ہنس کر جواب دیتے "ہاں ..... مجھے اپنی جیب میں پیسہ بوجھ ہی محسوس ہوتا ہے .....لیکن یہ بھی تو دیکھو کہ جونہی میری جیبیں خالی ہوتی ہیں' اللہ تعالیٰ اور پیسہ بھیج دیتے ہیں۔

ان کے اور ان کی دوسری بیوی کے درمیان اگر کبھی جھگڑا ہوتا تھا تو اسی وجہ سے ہوتا تھا۔ اکثر بیویوں کی طرح خانؑ صاحب کی دوسری بیوی کی بھی خواہش ہوتی تھی کہ آڑے وقت کے لئے کچھ بچا کر رکھا جائے۔

ایک بار ایک گاؤں کا چوہدری' خان صاحب کو اپنے گاؤں میں گانے کے لے مدعو کرنے آ گیا۔ خان صاحب نے اسے سمجھانے کی کوشش کی کہ گاؤں والے ان کی گائیکی سے مخطوظ نہیں ہو سکیں گے لیکن چوہدری انہیں بلانے پر مصر رہا۔ اس کی ضد کے سامنے آخر خان صاحب کو ہتھیار ڈالنے پڑے۔ مقررہ دن وہ اپنے سازندوں کے ہمراہ گاؤں پہنچے۔ جولائی کا مہینہ تھا۔ موسم گرم اور خشک تھا۔ دیہاتی رنگ برنگی پگڑیاں اور نئے کُرتے پہن کر پنڈال میں آئے ہوئے تھے۔ انہوں نے بڑے غلام علی خان صاحب کا نام تو بہت سنا ہوا تھا لیکن انہیں نہیں معلوم تھا کہ خان صاحب کس انداز کے گائیک ہیں یا کلاسیکی موسیقی کیا ہوتی ہے۔ خان صاحب نے حاضرین کے چہروں کا جائزہ لیا اور محفل کا آغاز راگ میاں کی ملہار سے کرنے کا فیصلہ کیا۔ خان صاحب نے گانا شروع کیا تو شروع میں دیہاتی سامعین کچھ کسمسائے اور پہلو بدلنے لگے لیکن جب وہ نیچے سُروں سے اونچے سروں کی طرف آئے تو رفتہ رفتہ ان کی آواز کی خوبصورتی اور سحر نے سیدھے سادے دیہاتیوں کو بھی اپنی گرفت میں لینا شروع کر دیا۔ پھر جب

Marfat.com

خان صاحب نے انترا گانے کے بعد آسمان کی طرف منہ کرکے الاپ شروع کیا تو ایک حیرت انگیز واقعہ رونما ہوا۔ چند لمحے پہلے آسمان پر سورج چمک رہا تھا لیکن الاپ شروع ہوتے ہی بادل اُمڈ آئے۔ سورج بادلوں کے عقب میں چھپ گیا اور جلد ہی بارش کی ٹھنڈی ٹھنڈی بوندیں حاضرین کو بھگونے لگیں۔ دیہاتی بے شک موسیقی کے رموز اور راگ کی باریکیوں کو نہیں سمجھتے تھے لیکن انہوں نے یہ ضرور محسوس کرلیا کہ جو کچھ ہو رہا تھا وہ خان صاحب کے گانے کا اثر تھا۔ وہ دم بہ خود ہو کر رہ گئے۔ ولمبت ختم ہونے کے بعد خان صاحب نے تیز انداز میں ایک بندش شروع کی:

بجری چمکے' برسے میہر
آئے لو بدروا
گرج گرج اَت موہے ڈراوے
گھن گرجے گھن بجری چمکے
پپیہا پپیہا تیری سنائے
کا کروں ماہی مورا جیا را لرجے

آسان زبان میں اس بندش کا مفہوم کچھ یوں ہے:

بجلی چمک رہی ہے اور بارش برس رہی ہے۔

لو' بادل آ گئے ہیں۔

یہ گرج گرج کر مجھے ڈرا رہے ہیں۔

کبھی بادل گرجتے ہیں' کبھی بجلی چمکتی ہے۔

پپیہا بھی تیرا ہی قصہ سنا رہا ہے۔

Marfat.com

میں کیا کروں' میرا دل کرلرز رہا ہے۔

خان صاحب گا رہے تھے' بارش جاری تھی اسی دوران میں قریبی جنگل سے دو مور تھرکتے ہوئے برآمد ہوئے۔ وہ سامعین کے گرد چکر کاٹ کر اسٹیج پر آ گئے اور پر پھیلائے وہاں تھرکنے لگے۔ یہ ایک ناقابل یقین نظارہ تھا۔ خان صاحب گاتے رہے' بارش برستی رہی' مور ناچتے رہے' سازندے گویا عالمِ بے خودی میں خان صاحب کی آواز کا ساتھ دیتے رہے اور سیدھے سادے دیہاتی بھی اس آواز ..... اور اس کے اثر سے مبہوت ہو کر بیٹھے رہے۔

.....☆.....

Marfat.com

ایک انوکھا رومان' ایک عجیب عشق

لاہور میں ہیرا منڈی کی ایک مغنّیہ' گلزار بائی کے بڑے چرچے تھے۔ ادھر خود گلزار بائی نے بڑے غلام علی صاحب کی حیرت انگیز گائیکی کے بڑے قصے سن رکھے تھے اور وہ ان سے ملاقات کی بڑی مشتاق تھی۔ آخر ایک بار اس نے خان صاحب کو ایک قاصد کے ہاتھ پیغام بھیج ہی دیا کہ وہ اس کے کوٹھے پر تشریف لائیں۔ دہلی کے چاؤڑی بازار یا لکھنؤ کے ''چوک'' کی طرح لاہور کی ہیرا منڈی کا ایک طلسم اور رومانوی تصور ہے۔ پارس اور راست باز انسانوں کی نظر میں یہ برائی کا منبع اور خرابیوں کی جڑ ہے جبکہ زندہ دل' فن پرست اور عام سے دنیا دار لوگوں کے لئے اس میں کئی طرح کی کشش ہے۔ انہیں یہاں کی باکمال مغنّیائیں' خوبصورت رقاصائیں اور دکھ درد بھلا دینے والے دوسرے عوامل اپنی طرف کھینچتے ہیں۔

آخر کار ایک روز غلام علی خان صاحب نے گلزار بائی سے ملنے کا قصد کر ہی لیا۔ ویسے تو وہ ایک بار پہلے ہی فیروز کے ہمراہ اس خاتون سے مل چکے تھے لیکن وہ ملاقات قصہ پارینہ ہو چکی تھی۔ اب غلام علی خان صاحب نے اسے دیکھا تو محسوس کیا کہ وہ تو پہلے سے بھی زیادہ خوبصورت ہو چکی تھی اور اب وہ ایک کامیاب مغنّیہ تھی۔ بڑی بڑی شخصیتیں اس کے کوٹھے پر آتی تھیں۔ اس زمانے میں امراء' معززین اور اعلیٰ

Marfat.com

طبقے کے افراد کا کسی معروف اور باکمال مغنّیہ کے کوٹھے پر جانا معیوب بات نہیں تھی۔ طوائفوں کے کوٹھے گویا امراء کے کلب تھے جہاں یہ خواتین ان کی میزبانی کے فرائض انجام دیتی تھیں جو حسین ہونے کے ساتھ ساتھ رقص یا گائیکی میں بھی ماہر ہوتی تھیں۔

A street scene of Heera Mandi - Lahore where Gulzar Bai lived

غلام علی خان صاحب خود گلزار کی آواز اور حسین شخصیت سے ایسے متاثر ہوئے کہ اکثر اس کے کوٹھے پر جانے لگے۔ حقیقت یہ تھی کہ وہ کھلتے گلاب کی سی شخصیت کی مالکہ اس مغنّیہ کے عشق میں گرفتار ہو چکے تھے۔ رات کو جب گلزار بائی کے کوٹھے پر محفل اختتام کو پہنچتی' گانا سننے اور مجرا دیکھنے والے تماش بین رخصت ہو جاتے' غلام علی خان تب بھی وہیں رکے رہتے۔ اس کے بعد گویا ان دونوں کی اپنی نجی محفل جمتی جس میں کبھی گلزار بائی گاتی تو کبھی خان صاحب کچھ سناتے۔ حتیٰ کہ وہ گلزار بائی کے گانے کے دوران سارنگی یا کوئی اور ساز بجانے کا فریضہ بھی انجام دیتے۔ دونوں

Marfat.com

موسیقی کے اسرار و رموز پر تبادلہ خیال کرتے۔ پر جوش انداز میں گھنٹوں انہی چند موضوعات پر باتیں کرتے جو دونوں کو محبوب تھے۔ یہ گویا دو ایسی روحوں کا ملاپ تھا جنہیں نہ جانے کب سے ایک دوسرے کی تلاش تھی۔

کبھی کبھار کچھ دوسرے استاد بھی گلزار بائی کے کوٹھے پر آجاتے تو یہ محفل گویا استادوں کی محفل ہو جاتی۔ موسیقی کی بڑی بڑی باریکیاں زیر بحث آتیں۔ ایک دوسرے کو اپنے خاص تجربات سے مستفید کیا جاتا۔ غلام علی خان صاحب اور گلزار بائی کے درمیان موسیقی کا بندھن رفتہ رفتہ محبت کے بندھن میں بدل گیا۔ ان کے لئے اب گویا ایک دوسرے سے جدائی کا تصور بھی محال تھا۔ ان کی جوڑی لیلیٰ مجنوں یا ہیر رانجھا کی تصوراتی جوڑی معلوم ہونے لگی تھی۔ خان صاحب نوجوانی میں رنڈوے ہو چکے تھے اور اب ''گلّو'' ان کی تمام تر توجہ اور محبت کا محور و مرکز تھی۔ دونوں چوبیس گھنٹے اکٹھے رہتے۔ دن میں غلام علی خان، گلزار کے لئے گانے کمپوز کرتے جنہیں وہ شام کو اپنے خاص اور چیدہ چیدہ قدر دانوں کے سامنے گاتی۔ یہ واقعی ایک تصوراتی قسم کا ..... اور قصے کہانیوں والا عشق جس میں مغنیہ، موسیقار اور نغمہ ..... تینوں ایک دوسرے میں مدغم ہو گئے تھے ..... لیکن محبت کی بیشتر داستانوں کی طرح اس داستان میں بھی آخر ایک رقیب گھس آیا۔ ایک روز گلزار بائی کی محفل میں ایک نیا تماش بین آیا اور جلد ہی گلزار کی ساری توجہ اس کی طرف ہو گئی۔ اس نے غلام علی خان صاحب کو بالکل نظر انداز کر دیا۔ برسوں بعد مجھ سے اس موضوع پر بات کرتے ہوئے لب لباب یہ نکالا

''طوائف بہر حال طوائف ہی رہتی ہے۔''

غلام علی خان صاحب کو جونہی نظر انداز کیے جانے کا احساس ہوا، انہوں نے

Marfat.com

گلزار بائی کا کوٹھا چھوڑا اور اپنا شکستہ دل لیے گھر لوٹ آئے۔ ان کے تمام خواب بکھر چکے تھے۔ نوجوانی میں انہیں بیوی کی موت کے بعد محبت کی موت کا صدمہ بھی اٹھانا پڑا تھا۔ دل شکستگی کے اس عالم میں انہوں نے کچھ بھی نہیں سوچا' بس ایک بیگ میں اپنے چند کپڑے ڈالے' اپنا سُر منڈلی اٹھایا اور ریلوے اسٹیشن آ گئے۔ ٹکٹ کلرک نے ان سے پوچھا ''کہاں جانا ہے''؟ تو انہوں نے جواب دیا ''پہلی ٹرین جہاں بھی جا رہی ہے وہاں کا ٹکٹ دے دو۔'' ان کے انداز میں ایک عجیب بے دھیانی' لاتعلق اور عدم دلچسپی تھی۔

پہلی ٹرین آدھے گھنٹے بعد بمبئی جا رہی تھی چنانچہ غلام علی ،خان صاحب اس میں بیٹھے اور سوچے بغیر' بالکل ڈرامائی اور فلمی انداز میں بمبئی روانہ ہو گئے۔ اپنے آبادی شہر کو انہوں نے خیر باد کہہ دیا۔ تاہم اس وقت ان کے ذہن میں یہ خیال نہیں تھا کہ بمبئی' ہندوستان کے نہ جانے کتنے نوجوانوں کی آرزوؤں اور امنگوں کا مرکز تھا۔ نہ جانے کتنے لوگ وہاں کی شاہراہوں پر وقت کی دھول میں گم ہو گئے تھے مگر کتنے ہی ایسے بھی تھے جنہیں اس شہر میں ان کے خوابوں سے بڑھ کر ملا تھا۔ اس شہر نے بہت سے فنکاروں کو ..... اور خاص طور پر کلاسیکی ہندوستانی موسیقی کے ماہرین کو سینے سے لگایا تھا۔

.....☆.....

Marfat.com

بمبئی میں آمد

استاد بڑے غلام علی 1940ء میں بمبئی پہنچے۔ یہ دور فنونِ لطیفہ کے لئے خوشگوار تھا۔ فن اپنی اصل شکل میں زندہ تھا اور اسے پروان چڑھانے کے لئے بہت سے فنکار اپنے اپنے میدان میں نہایت سرگرمی سے مصروفِ عمل تھے۔ فلمی دنیا میں ''بولتی فلموں'' کے آغاز سے ایک نیا ولولہ اور جوش و خروش پایا جاتا تھا۔ موسیقاروں اور سازندوں کی بڑی مانگ تھی۔ ہندوستان کے اکثر شہزادوں اور نوابزادوں وغیرہ کی قیام گاہیں بمبئی میں بھی موجود تھیں جہاں بڑے پیمانے پر ان کے مختلف قسم کے جلسے، اجلاس اور محفلیں منعقد ہوتی رہتی تھیں۔ اندور، گوالیار اور کشمیر کے مہاراجاؤں کے علاوہ حیدر آباد دکن کے شہزادے بھی بمبئی میں اپنی شاندار اور پرتعیش قیام گاہوں پر آتے رہتے تھے۔ ان کے قیام کے دوران طرح طرح کی محفلیں منعقد ہوتی تھیں جن میں مختلف فنون کے استادوں کو بڑی عزت و تکریم سے مدعو کیا جاتا تھا۔ فلم اسٹارز کو اس وقت تک ایسی اہمیت اور توجہ حاصل نہیں ہوئی تھی جیسی آج کے دور میں ہے۔ کلاسیکل فنکاروں کا مقام و مرتبہ زیادہ بلند تھا۔

بمبئی کے وکٹوریہ اسٹیشن پر اتر کر غلام علی خان نے ادھر ادھر سے کچھ معلومات حاصل کیں۔ انہوں نے اپنے استاد کالے خان سے سن رکھا تھا کہ بمبئی میں زیادہ تر

Marfat.com

اچھے کلاسیکل گویے بھنڈی بازار کے علاقے میں رہتے ہیں۔ خاص طورانہوں نے استاد کی زبانی ایک مغنیہ گنگا بائی کا نام سنا تھا۔ تھوڑی بہت کوشش کے بعد انہوں نے گنگا بائی کا گھر تلاش کر ہی لیا جو کینیڈی برج کے قریب واقع تھا۔ مشہور فن کدہ ''اوپیرا ہاؤس'' بھی وہاں سے دور نہیں تھا۔ گنگا بائی نے نہایت گرم جوشی سے غلام علی خان کا استقبال کیا اور ان کے ساتھ بہت عزت سے پیش آئی۔ چند سال پہلے استاد کالے خان بھی بمبئی آئے تھے اور کالے نذیر خان صاحب کے گھر میں ٹھہرے تھے۔ کالے نذیر خان صاحب گنگا بائی کے استاد یا گرو تھے۔ گنگا بائی بڑی عمر کی ایک باوقار' وضعدار اور رکھ رکھاؤ والی عورت تھی جو درحقیقت نینی تال کے قریبی علاقے ''کماؤں ہلز'' سے آئی تھی اور بمبئی میں سکونت پذیر ہوگئی تھی۔ اس کے گھر پر بڑے بڑے فنکار' موسیقار اور گویے جمع ہوتے تھے۔ گنگا بائی خود بھی اعلیٰ درجے کی مغنیہ اور گلوکارہ تھی۔ اس نے بمبئی میں بڑا مقام بنا لیا تھا۔ اس کی جوان بیٹی سروپ رانی بھی بے حد خوبصورت اور باصلاحیت تھی۔ وہ ان دنوں استاد جھنجو خان سے گائیکی کی تربیت حاصل کر رہی تھی۔

یہ کوئی حیرت کی بات نہیں تھی کہ غلام علی خان' گنگا بائی کو پہلے دن سے اچھے لگے تھے۔ وہ دیہی علاقے میں پل کر جوان ہوئے تھے۔ شخصیت میں وجاہت تھی۔ صحیح معنوں میں ایک گھبرو جوان تھے۔ وہ بیشک تہی دست تھے لیکن فن کی بے پناہ دولت ان کے پاس تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ نہایت ہی سادہ مزاج انسان تھے۔ ان کی شخصیت میں کوئی گھماؤ پھراؤ اور پیچیدگی نہیں تھی۔ لچھے دار گفتگو کرنی انہیں نہیں آتی تھی۔ اس قسم کے لوگ بمبئی جیسے شہر میں کم ہی دیکھنے میں آتے تھے۔ گنگا بائی کو وہ ایک معصوم بچہ کی طرح لگے اور اس نے گویا انہیں اپنی پناہ میں لے لیا۔ انہیں گاتے سن کر وہ اور بھی

Marfat.com

زیادہ خوش ہوتی تھیں۔فن کی قدر مشترک نے ان کے درمیان اپنائیت کے بندھن کو اور بھی مضبوط کر دیا تھا۔

Ustad Nizamuddin Khan

بعد میں غلام علی خان صاحب نے میرے سامنے گنگا بائی کا تذکرہ نہایت ممنونیت سے کرتے ہوئے بتایا کہ ان کا بمبئی میں قدم جمانا اسی خاتون کی وجہ سے ممکن ہوا۔ اگر گنگا بائی ابتداء میں ان کا ہاتھ نہ تھامتی اور ان کی ہر ممکن مدد اور سرپرستی نہ کرتی تو شاید وہ بمبئی میں اس مقام تک نہ پہنچ پاتے جو بعد میں انہیں حاصل ہوا۔

موسیقی کے عاشقوں کو جب پتہ چلا کہ قصور سے ایک نوجوان گویّا آیا ہے جس کی آواز میں انوکھی مٹھاس ہے، جسے فن پر بھی عبور حاصل ہے .....اور جس کی شخصیت محفل میں سجتی بھی بہت ہے .....تو وہ بڑی تعداد میں ان سے ملنے اور انہیں سننے کے لئے آنے لگے۔گنگا بائی کا بھرپور تعاون اور سرپرستی انہیں حاصل تھی۔گانے کی

Marfat.com

محفلیں سجنے لگیں۔ غلام علی خان پر داد و تحسین کی بارش ہونے لگی اور وہ جلد ہی اپنا غم بھول گئے۔ گلزار بیگم کی بے وفائی کا زخم ان کے سینے میں مندمل ہونے لگا۔ انہوں نے ایک بار پھر بھرپور ریاض اور نئی نئی بندشیں تیار کرنا شروع کر دیا۔ اسی دوران میں ایک نوجوان طبلہ نواز نظام الدین خان نے گنگا بائی کے ہاں آ کر بڑے اشتیاق سے غلام علی خان صاحب سے ملاقات کی۔ دونوں کو ایک دوسرے کی عادات اور فنی مہارت ایک دوسرے کے قریب لے آئی۔ ریاض اور محفل آرائی کے دوران میں نظام الدین مستقل طور پر طبلے پر غلام علی خان صاحب کی سنگت کرنے لگے۔

اس دوران گنگا بائی نے اپنی دوست جدّن بائی کے گھر پر ایک بڑی محفل کا اہتمام کیا جس کے سامعین میں زیادہ تعداد فلمی دنیا سے وابستہ لوگوں کی تھی۔ جدّن بائی مشہور فلم اسٹار نرگس کی والدہ تھیں۔ وہی نرگس جو آج کے فلم اسٹار سنجے دت کی والدہ تھیں۔ لیکن اس وقت تک وہ مشہور نہیں ہوئی تھیں۔ فلمی دنیا کے بیشتر لوگ بھی کلاسیکی موسیقی کو ذرا بوجھل قسم کی چیز سمجھتے تھے۔ غلام علی خان نے ان کے سامنے دل ہی دل میں خدا سے دعا مانگنے کے بعد گانا شروع کیا تو کلاسیکل موسیقی کو بوجھل سمجھنے والوں کو بھی ان کی آواز کے سحر نے رفتہ رفتہ اپنی گرفت میں لے لیا۔ ان کی آواز میں بلا کا سوز و گداز تھا جو شاید گلزار بیگم کی بے وفائی کے دیئے ہوئے زخم کی پیداوار تھی۔ اس سوز و گداز نے وہاں موجود ہر شخص کے دل کو چھولیا۔ جسے کلاسیکی موسیقی کی زیادہ سمجھ نہیں تھی، اسے بھی غلام علی خان صاحب کا گانا پسند آیا۔ جب انہوں نے گانا ختم کیا تو انہیں جتنی داد ملی، اس کا انہوں نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔ وہیں انہیں مختلف جگہوں پر گانے کی دعوتیں ملنے لگیں۔ اس کے علاوہ لوگوں نے ان کی خدمت میں ''نذرانے بھی پیش

Marfat.com

کیے۔

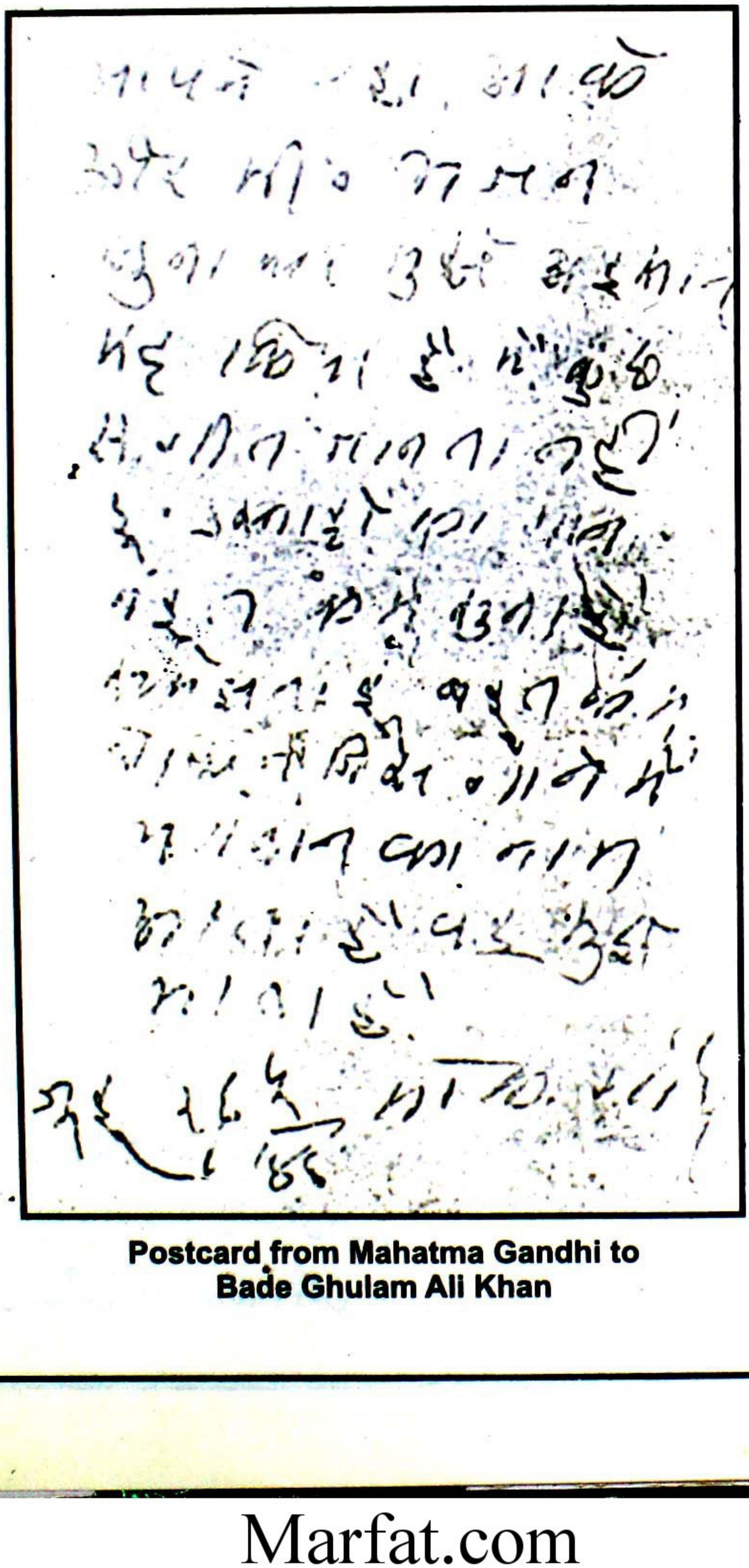

Postcard from Mahatma Gandhi to Bade Ghulam Ali Khan

Marfat.com

چند ماہ میں غلام علی نئی زندگی کے معمولات میں ڈھل گئے۔ انہوں نے پلٹ کر گلزار بیگم کی طرف دیکھا تک نہیں۔ انہوں نے اسے خط بھی نہیں لکھا۔ ادھر لاہور میں گلزار بیگم کے دل کی دنیا میں عجیب انقلاب آیا۔ اسے غلام علی خان صاحب سے جدائی پر پچھتاوے کا احساس ہونے لگا۔ اپنے رویّے پر ندامت ہونے لگی۔ اس کا خیال تھا کہ اس نے جو کچھ کیا تھا' وہ کوئی خاص بات نہیں تھی اور غلام علی کا غصہ چند دن میں ٹھنڈا ہو جائے گا۔ وہ خود ہی اس کے پاس لوٹ آئیں گے ..... لیکن جب وہ نہیں آئے اور نہ ہی انہوں نے کسی بھی طریقے سے اس سے رابطہ کیا تو اُسے یوں لگنے لگا جیسے اس نے اپنی متاعِ حیات کھو دی تھی۔ پچھتاوے اور جدائی کی اذیت نے اسے اس حد تک بے قرار کیا کہ وہ ان کا اتا پتا کر کے' انہیں ڈھونڈتی ہوئی گنگا بائی کے گھر بمبئی آن پہنچی۔ غلام علی تو اس سے ملاقات کے لئے بھی تیار نہیں تھے۔ گنگا بائی کی سفارش پر انہوں نے ملاقات کی۔ گلزار بیگم نے اپنی غلطی کی رو رو کر معافی مانگی اور ان سے التجا کی وہ اس کے ساتھ لاہور واپس چلیں لیکن غلام علی خان صاحب نے سختی سے انکار کر دیا۔

گلزار بیگم نے یہاں تک پیشکش کی کہ وہ اپنی ساری دولت اور جائیداد ان کے نام کر دے گی۔ گانا چھوڑ دے گی اور زندگی بھر کے لئے صرف اور صرف ان کی ہو کر رہے گی ..... مگر غلام علی کے لئے گویا اس قسم کی پیشکشوں میں کوئی کشش نہیں تھی۔ گو کہ گلزار بیگم نے پہلے بھی درحقیقت ان سے صحیح معنوں میں بے وفائی نہیں کی تھی .....بس وہ محفل میں ایک صاحب کی طرف ذرا زیادہ توجہ دینے لگی تھی اور ان کے مقابلے میں غلام علی خان صاحب کو ذرا نظر انداز کرنے لگی تھی۔ غلام علی کو برگشتہ کرنے

Marfat.com

کے لئے محض اتنا ہی کافی تھا۔ وہ اب کسی بھی قیمت پر گلزار بیگم کو معاف کرنے کے لئے تیار نہیں تھے۔ وہ پنجاب کے ایک روایتی مرد تھے اور ان کی مجروح انا کا اب گویا کوئی مداوا نہیں تھا۔ گنگا بائی کے گھر پر آخری ملاقات کے دوران غلام علی خان صاحب نے گلزار بیگم کا ''پاندان'' اتنے زور سے ہاتھ سے پیچھے ہٹایا کہ وہ دیوار سے جا ٹکرایا۔ یہ گویا اس بات کا واضح اعلان تھا کہ انہوں نے گلزار بیگم کو ہمیشہ کے لئے اپنی زندگی سے نکال دیا تھا۔

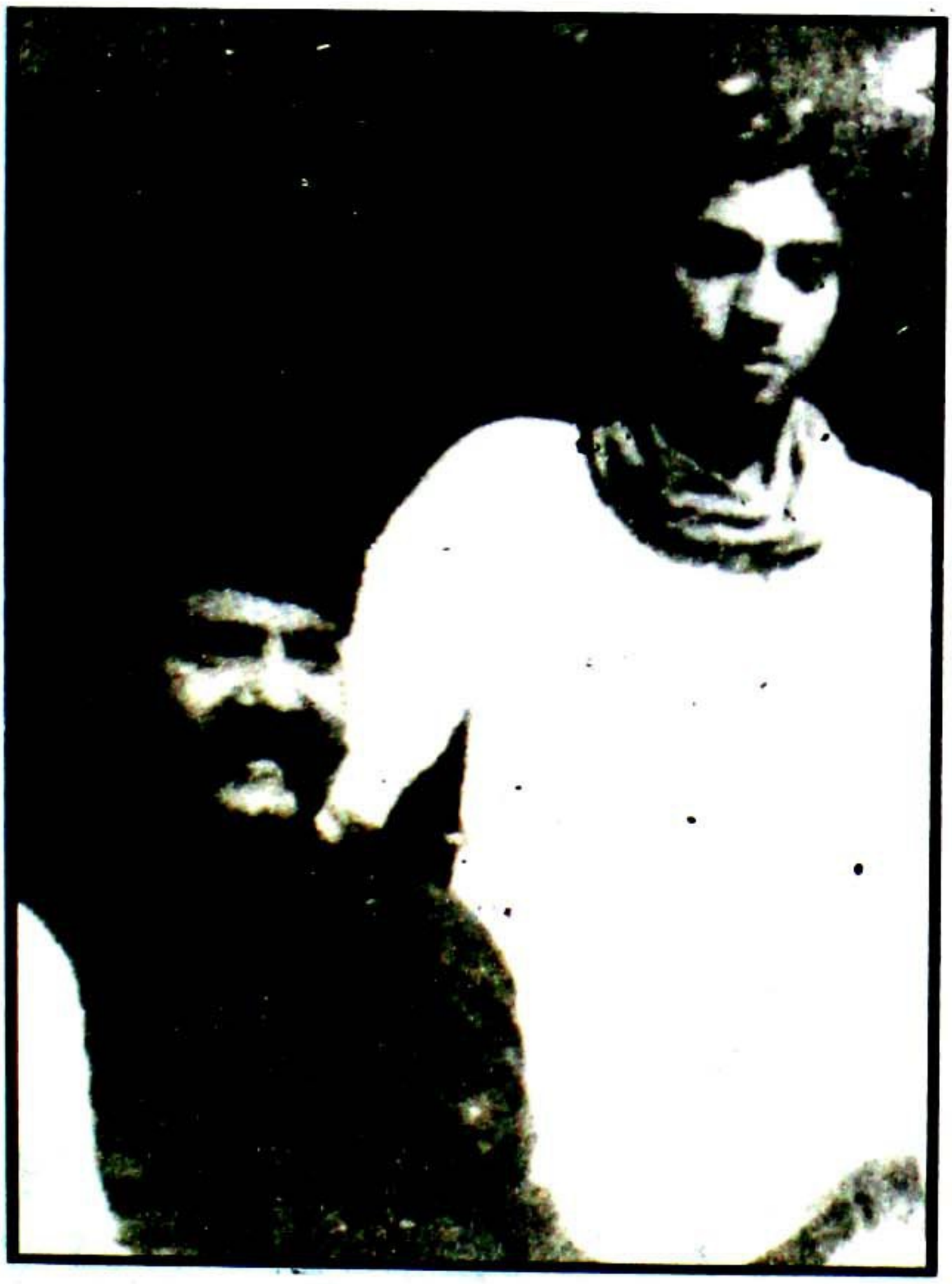

Bade Ghulam Ali Khan and Munawar

گلزار بیگم ناکام و نامراد اور دل شکستہ لاہور واپس چلی گئی اور پھر کبھی بمبئی نہیں

Marfat.com

آئی۔ عشق کی اس داستان کا یہ اختتام 1941ء میں ہوا جب ہندوستان کی تقسیم عمل میں نہیں آئی تھی۔ لاہور اور بمبئی دونوں ہی ہندوستان کے دوشہر تھے جو ایک دوسرے سے بہت مختلف اور اپنی اپنی جگہ منفرد تھے۔ ان دنوں ان دونوں شہروں کے درمیان آمدو رفت کوئی مسئلہ نہیں تھی مگر غلام علی اور گلزار بیگم کے دل، تقسیم ہند سے پہلے ہی تقسیم ہو گئے اور ان کے درمیان ہمیشہ کے لئے جدائی کی دیوار کھڑی ہو گئی۔

انگریز حکمرانوں کے لئے یہ خاصا پریشانی کا دور تھا۔ اسی طرف وہ دوسری عالمگیر جنگ میں الجھ چکے تھے۔ دوسری طرف ہندوستان میں انہیں تحریک آزادی کا سامنا تھا۔ گویئے اور موسیقار بھی اس تحریک میں پیچھے نہیں تھے۔ مختلف قومی زبانوں میں ترانے اور تحریکی گیت لکھے جا رہے تھے۔ بڑے بڑے شاعر یہ گیت لکھ رہے تھے اور بڑے بڑے موسیقار اور گلوکاران کی تیاری میں حصہ لے رہے تھے جس کے بعد یہ گیت اور ترانے گلی گلی گونج رہے تھے۔ فلمی دنیا میں اور آل انڈیا ریڈیو پر موسیقاروں اور گویوں کی مانگ بڑھ گئی تھی۔ بمبئی، لکھنؤ اور لاہور کے ریڈیو اسٹیشن اپنے خصوصی پروگراموں کی وجہ سے بہت تیزی سے اور زیادہ مقولیت حاصل کرنے لگے تھے۔ ہلکی پھلکی موسیقی کے ساتھ کلاسیکی موسیقی بھی عوام تک رسائی حاصل کرنے لگی تھی۔

غلام علی نے بہت پہلے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ کبھی درباری گویئے نہیں بنیں گے۔ وہ جب افغانستان گئے تو ظاہر شاہ نے انہیں مستقل طور پر کابل میں رکنے کے لئے زمین، بھاری وظیفے اور دیگر مراعات کی ترغیب دی مگر وہ نہیں مانے۔ ایک تو وہ نہایت خوددار تھے۔ دوسرے ان کے مزاج میں درویشی تھی۔ انہیں راجوں مہاراجوں کی پروا نہیں تھی۔ اندر سے وہ گویا ایک صوفی تھے اور بڑے لوگوں سے ہی نہیں، چھوٹوں سے بھی خود آگے بڑھ کر مل لیتے تے۔ ایک بار ایک مغلوک الحال، جوتی قسم کا آدمی ان

Marfat.com

سے ملنے گنگا بائی کے گھر آیا۔ گوکہ اس طرح کے آدمیوں کی گنگا بائی کے گھر میں رسائی نہیں تھی لیکن غلام علی خان اس سے مل لیے۔ اس نے ایک نظم لکھی تھی جو وہ غلام علی خاں کو سنانا چاہتا تھا۔ اس کی پہلی لائن تھی:

ہری اوم تت ست

ان الفاظ سے ہی غلام علی خان کو کچھ ایسی تحریک ملی کو وہ سُر منڈلی لے کر آ بیٹھ گئے۔ انہوں نے اس نظم کو ..... جو ایک طرح کا بھجن تھی، راگ پہاڑی میں کمپوز کیا اور یہ بے حد مقبول ہوئی۔ بعد میں غلام علی خان صاحب کو یہ نظم ایک محفل میں مہاتما گاندھی صاحب کی موجودگی میں سنانے کا موقع ملا۔ انہوں نے اسے پسند کیا اور اپنی پسندیدگی کے باقاعدہ اظہار کے لئے غلام علی خان صاحب کو بعد میں ایک پوسٹ کارڈ بھی لکھا۔

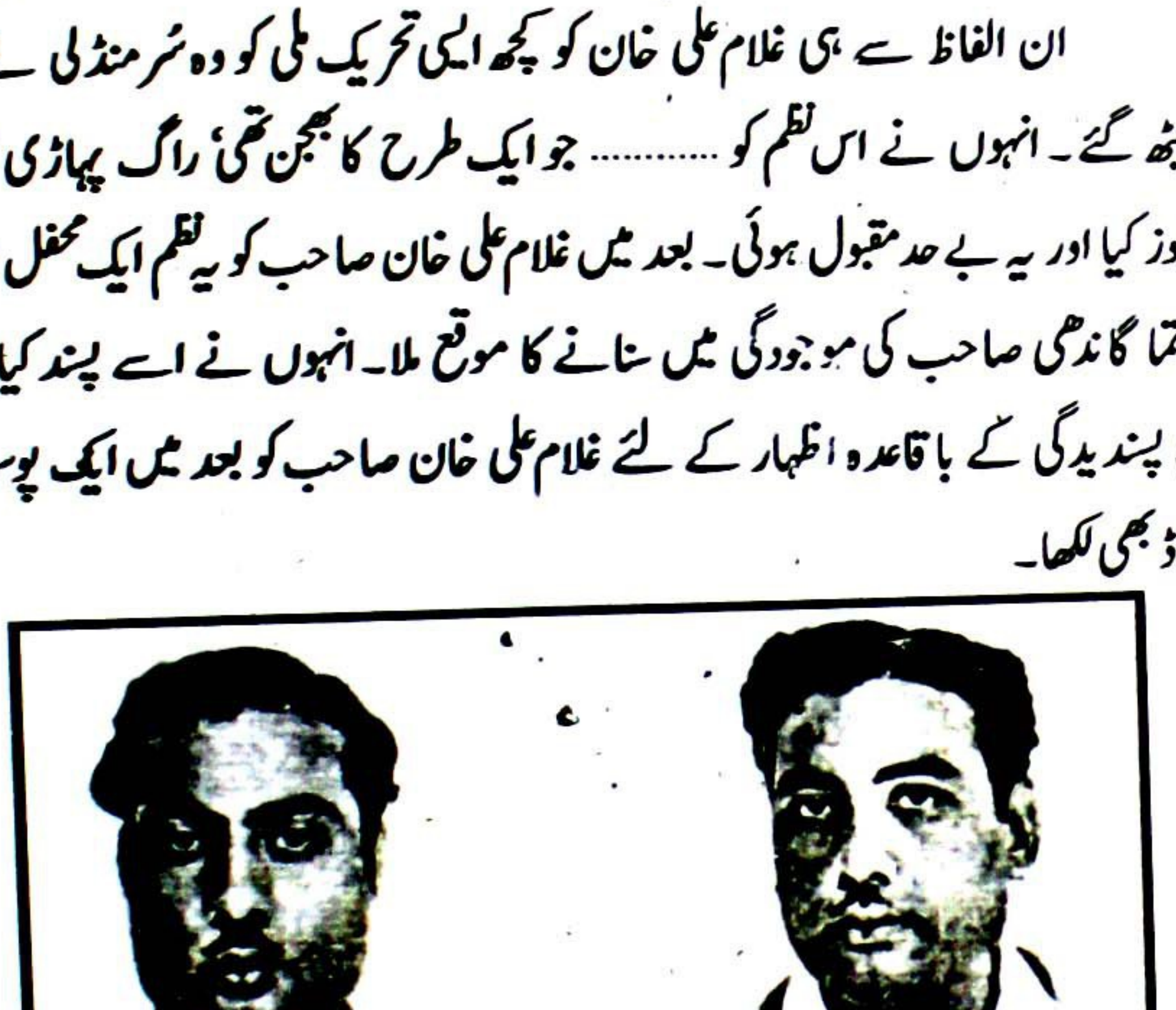

Munawar Ali Khan and Karamat Ali Khan

برسوں بعد ایک بار کسی نے خان صاحب سے پوچھا "آپ نے مسلمان ہوتے ہوئے ایک بھجن اتنا ڈوب کر کیسے گایا"؟

Marfat.com

خان صاحب نے جواب دیا 'میں جب بھی کوئی ایسی چیز گاؤں جس میں کسی ہستی کی عظمت اور وحدانیت کا ذکر ہوتا ہے ..... خواہ وہ بھجن ہو یا کچھ اور ..... میرے ذہن میں صرف خدا کا تصور ہوتا ہے ..... زبان کوئی سی بھی ہو ..... لفظ کچھ بھی استعمال کیا جائے ..... میرے ذہن میں خالق کائنات کا خیال ہوتا ہے۔

اس زمانے میں غلام علی خان صاحب کو جگہ جگہ گانے کے لئے مدعو کیا جا رہا تھا۔ ان پر دعوتوں کی گویا بارش ہو رہی تھی۔ اسی زمانے میں انہیں لاہور سے اپنے بیٹے منور کا خط ملا جس نے لکھا تھا کہ وہ انہیں بہت یاد کرتا ہے' ان کی بہت کمی محسوس کرتا ہے اور اگر وہ پرندہ ہوتا تو اڑ کر ان کے پاس آ جاتا۔ یہ خط پڑھ کر غلام علی خان صاحب پر یہ رقت طاری ہو گئی۔ انہوں نے اپنے تمام پروگرام منسوخ کر دیے اور بیٹے سے ملنے لاہور روانہ ہو گئے۔

لاہور میں ان کے دونوں بیٹوں کی پرورش اور دیکھ بھال خادم حسین اور ان کی فیملی کر رہی تھی۔ خادم حسین ان کے سالے بھی تھے اور بہنوئی بھی ..... ان کی بیوی غلام علی کی بہن تھیں اور غلام علی کی بیوی خادم حسین کی بہن تھیں۔ غلام علی لاہور پہنچے تو ان کی واپسی کی خبر دور دور تک پہنچ گئی۔ ان کا استقبال کچھ اس طرح ہوا جیسے میدان جنگ میں بہت بڑی فتح حاصل کر کے کوئی جنرل اپنے وطن واپس آیا ہو۔ ویسے وہ گانے کے میدان میں تو بہرحال بڑی بڑی جنگیں جیت کر آ رہے تھے۔ لاہور میں ان کے مداحوں' شاگردوں اور بہت سے عام لوگوں کو بھی علم تھا کہ بمبئی میں انہیں کیسی کیسی کامیابیاں حاصل ہوئی ہیں اور کتنی بڑی بڑی شخصیتوں کے سامنے گا کر انہوں نے بے اندازہ داد تحسین سمیٹی ہے' کتنی بڑی بڑی میوزک کانفرنسوں میں انہوں نے شرکت کی ہے ..... چنانچہ لاہور کے شہری ان پر بجا طور پر ہی فخر کر رہے تھے۔

Marfat.com

ان کی بہن ان کے دونوں بیٹوں کی پرورش جی جان سے کر رہی تھیں۔ غلام علی یہ دیکھ کر بہت خوش ہوئے کہ ان کے بیٹے آسائشوں اور محبت سے محروم نہیں تھے۔ دونوں مشن ہائی سکول میں پڑھنے جاتے تھے۔ اسی دوران خادم حسین کے ہاں ایک بچی کی ولادت ہوئی۔ ان کے ہاں چار بیٹوں کے بعد بیٹی ہوئی تھی اور وہ اس پر بہت خوش تھے۔ اس بچی کا نام عظمت رکھا گیا۔ اس کی پیدائش پر غلام علی خان بھی اتنے خوش تھے کہ انہوں نے اسی وقت اس کا ہاتھ منور علی کے لئے مانگ لیا۔ یہ طے پا گیا کہ جب وہ بڑی ہو گی تو اس کی شادی غلام علی خان صاحب کے بڑے صاحبزادے منور علی سے ہو گی۔ انہوں نے منور علی کو اپنا جانشین بنانے میں بھی دلچسپی لینا شروع کر دی اور اسے گانے کی ''تعلیم'' دینا شروع کر دی۔ منور علی نے بہت زیادہ لگن سے گانے کی تربیت حاصل کرنا شروع کی۔ وہ گھر کے برآمدے میں بیٹھے گھنٹوں ریاض کرتے اور دھوپ بھی آجاتی تو انہیں گویا کچھ ہوش نہ ہوتا۔ ایک تو وہ اپنے والد کے پرستار بھی تھے۔ دوسرے انہیں بڑے اشتیاق سے ان دنوں کا انتظار تھا جب ان کے والد انہیں اپنے ساتھ موسیقی کی بڑی بڑی محفلوں اور کانفرنسوں میں لے جایا کریں۔

1943ء شروع ہو گیا تھا۔ دوسری عالمی جنگ جاری تھی۔ انگریز پورے ہندوستان میں اپنے حق میں فضا ہموار کرنے کے لئے مختلف اقدامات کر رہے تھے جن میں نغمات کی تیاری بھی شامل تھی جن کے لئے بڑے بڑے فنکاروں اور شاعروں کی خدمات حاصل کی جا رہی تھیں۔ لاہور میں بھی ان کے اثرات دیکھنے میں آئے تھے۔ حفیظ جالندھری نے اسی دور میں یہ مشہور نغمہ لکھا تھا:

یہ اڑوسن پڑوسن جو بھی کہے
میں تو چھورے کو بھرتی کرا آئی رے

یہ نغمہ ملکہ پکھراج جیسی بلند پایہ گلوکارہ نے گایا تھا۔ جو لوگ تحریک آزادی میں

Marfat.com

سرگرم تھے۔ وہ اس قسم کی کوششوں کا مذاق اڑاتے تھے اور اس قسم کے نغموں کے مقابلے میں اپنے نغمے تیار کرتے تھے۔

ایک بڑے فنکار کو کسی بھی وقت، کوئی بھی چیز، تخلیق کے سلسلے میں انسپائر کر سکتی ہے، تحریک دے سکتی ہے۔ غلام علی خان صاحب کے ساتھ بھی ایسا ہوتا رہتا تھا۔ ایک بار وہ فلم دیکھنے سینما ہاؤس گئے۔ فلم انگریزی تھی اور اس کے ایک سین میں طیارے دشمن پر بمباری کر رہے تھے۔ طیاروں کی گھن گرج اور بموں کے دھماکوں سے تحریک پا کر غلام علی خان نے وہیں ایک دھن ترتیب دینی شروع کی جس میں ان آوازوں کا تاثر موجود تھا۔ وہ یہی دھن زیر لب گنگناتے ہوئے سینما ہال سے نکلے اور گھر جاتے ہی اسے کمپوز کیا۔

ایک بار میلے میں خان صاحب نے ایک بازی گر کو دیکھا جو ہوا میں خنجر اونچا اچھالتا تھا اور اس کے نیچے منہ کر کے اسے دانتوں سے تھامتا تھا۔ اس کے اس جرأت مندانہ تماشے میں اتنی مہارت اور صفائی تھی کہ خان صاحب بیسیوں مرتبہ اس کا یہ کھیل دیکھنے گئے۔ پھر انہوں نے اس تاثر کو خیال کی گائیکی میں سمویا۔ تان کو اسی طرح یک دم بلند کرنے اور نیچے لانے پر انہیں ان کی خصوصی مہارت کی بدولت، صرف فن شناسوں سے ہی نہیں، عام سامعین سے بھی بے پناہ داد ملتی تھی۔

☆☆☆☆☆

Marfat.com

سفر در سفر

لاہور میں قیام کے دوران خان صاحب کو بمبئی کی یاد نے کچھ زیادہ بے قرار نہیں کیا۔ وہ چونکہ اندر سے مطمئن اور درویش صفت آدمی تھے' اس لئے جہاں بھی رہتے' اپنے کام' مقام اور مرتبے سے مطمئن رہتے تھے۔ لاہور میں وہ موسم بہار کی ایک خوشگور دوپہر میں اطمینان سے صحن میں بیٹھے ریاض کر رہے تھے اور ہندول راگ گا رہے تھے کہ پوسٹ مین نے انہیں ایک دعوت نامہ لا کر دیا۔ بمبئی میں مہاراجہ وکرم آدتیہ کے راج کی دو ہزار ویں سالگرہ منانے کے لئے ''وکرم آدتیہ میوزک کانفرنس'' منعقد ہو رہی تھی۔ مہاراجہ وکرم آدتیہ کو موسیقی کا بڑا دلدادہ سمجھا جاتا ہے۔ اس کے دربار میں مختلف شعبوں میں بے پناہ کمال رکھنے والے نو ذہین ترین مصاحب موجود رہتے تھے جنہیں ''نو رتن'' یعنی ''نو جواہر'' کہا جاتا تھا۔ اسی طرح بعد میں شہنشاہ اکبر نے بھی اپنے دربار میں مختلف شعبہ ہائے زندگی کے نو لائق ترین افراد جمع کیے تھے۔

''وکرم آدتیہ میوزک کانفرنس'' میں شرکت کے لئے خان صاحب کو ایک بار پھر بمبئی کا سفر اختیار کرنا پڑا۔ 1944ء میں وہ بمبئی روانہ ہوئے تو اس بار ان کے اپنے سازندے اور دونوں کم عمر بیٹے بھی ان کے ہمراہ تھے۔ انہوں نے بیٹوں کو موسیقی کی دنیا اور بڑے شہروں کے طور طریقوں سے روشناس کرانے کا عمل شروع کرنے کا فیصلہ کر لیا

Marfat.com

تھا۔ اب وہ خود بھی پہلے کی طرح محض ایک سادہ لوح دیہاتی نوجوان نہیں تھے۔ اب انہوں نے زمانے کے کچھ نشیب و فراز دیکھ لیے تھے۔ ان کے فن میں بھی پہلے سے زیادہ پختگی اور ان کی انداز و اطوار میں استادوں والا اعتماد آچکا تھا۔

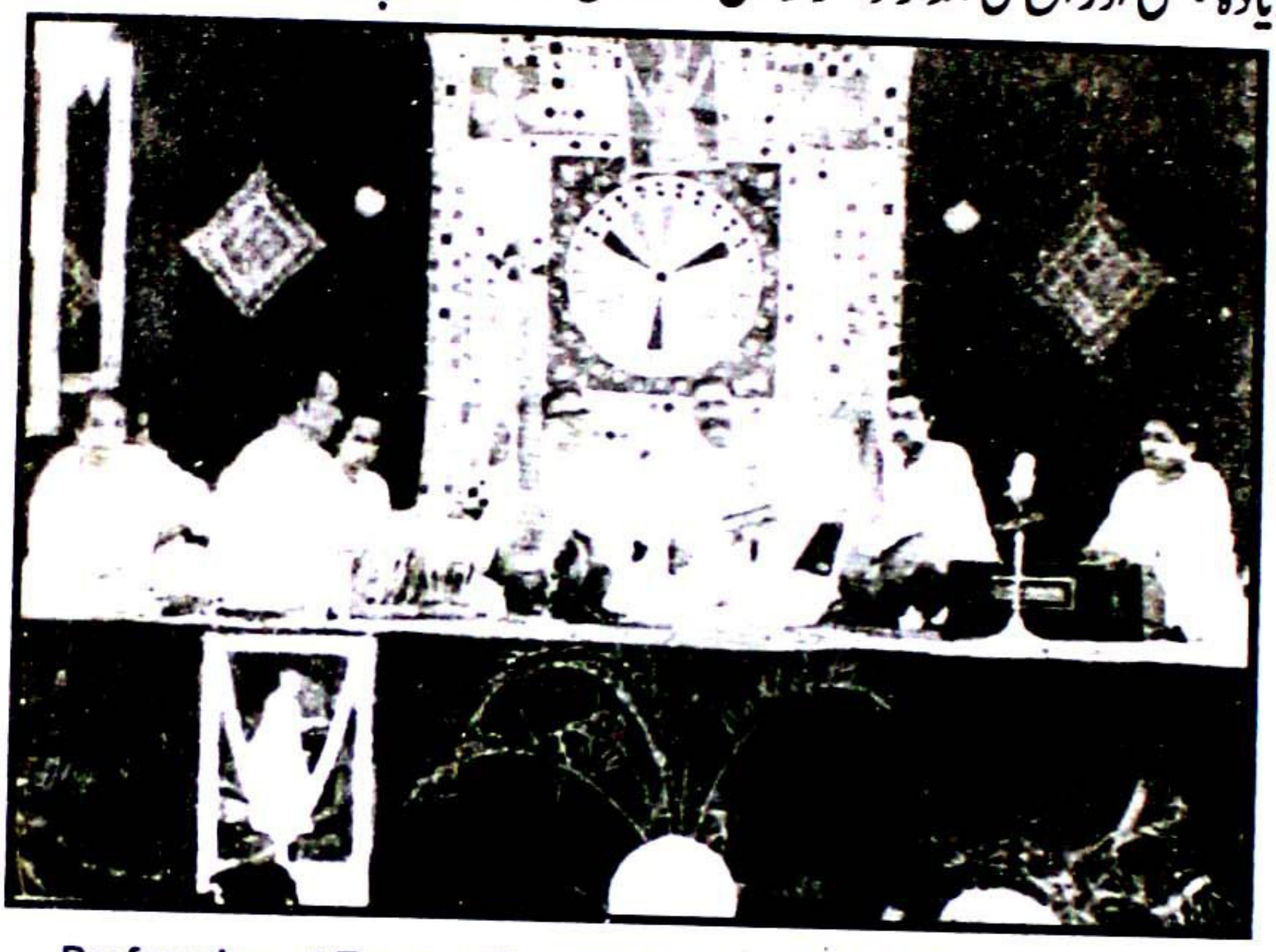

Performing at Tansen Samaroh - Prem Vallabh on the tabla, Ustad Bade Ghulam Ali Khan, Munawar Ali Khan and Amir Ali Khan

اس میوزک کانفرنس میں ان کا سامنا موسیقی کی دنیا کی نہایت قدآور شخصیت استاد فیاض علی خان اور ان جیسے دوسرے بہت سے بڑے موسیقاروں اور گویوں سے ہوا۔ انہوں نے اپنے گانے کا آغاز راگ مروا سے کیا۔ پھر راگ پوریا گایا۔ موسیقی کے نقاد ان کی مہارت پر دنگ رہ گئے اور انہوں نے محسوس کرلیا کہ ہندوستانی موسیقی کے افق پر ایک نیا جگمگاتا ستارہ نمودار ہو چکا تھا۔ پنجاب کے نوجوان مہاراشٹر کے موسیقی کے میدان میں اپنی دھاک بٹھا دی تھی۔ یہ کانفرنس موسیقی سے متعلق سرگرمیوں میں بہت زیادہ اہمیت کی حامل تھی۔ اس میں صرف اعلیٰ درجے کے گانے والوں کو مدعو کیا جاتا تھا۔

Marfat.com

Balasubramaniam with Bade Ghulam Ali at Mahabalipuram in Madras

موسیقی کی دنیا کی ایک بہت بڑی شخصیت پروفیسر ڈیو دھر جو میوزک کا ایک بڑا اور باوقار سکول چلاتے تھے۔ کانفرنس کے اختتام پر خان صاحب کے پاس آئے اور سحرزدہ انداز میں بولے ''خان صاحب! آپ کی آواز میں جو طاقت ہے اس کا راز کیا ہے''؟

Marfat.com

Munawar and Bade Ghulam Ali Khan with learned pundits of music in Madras

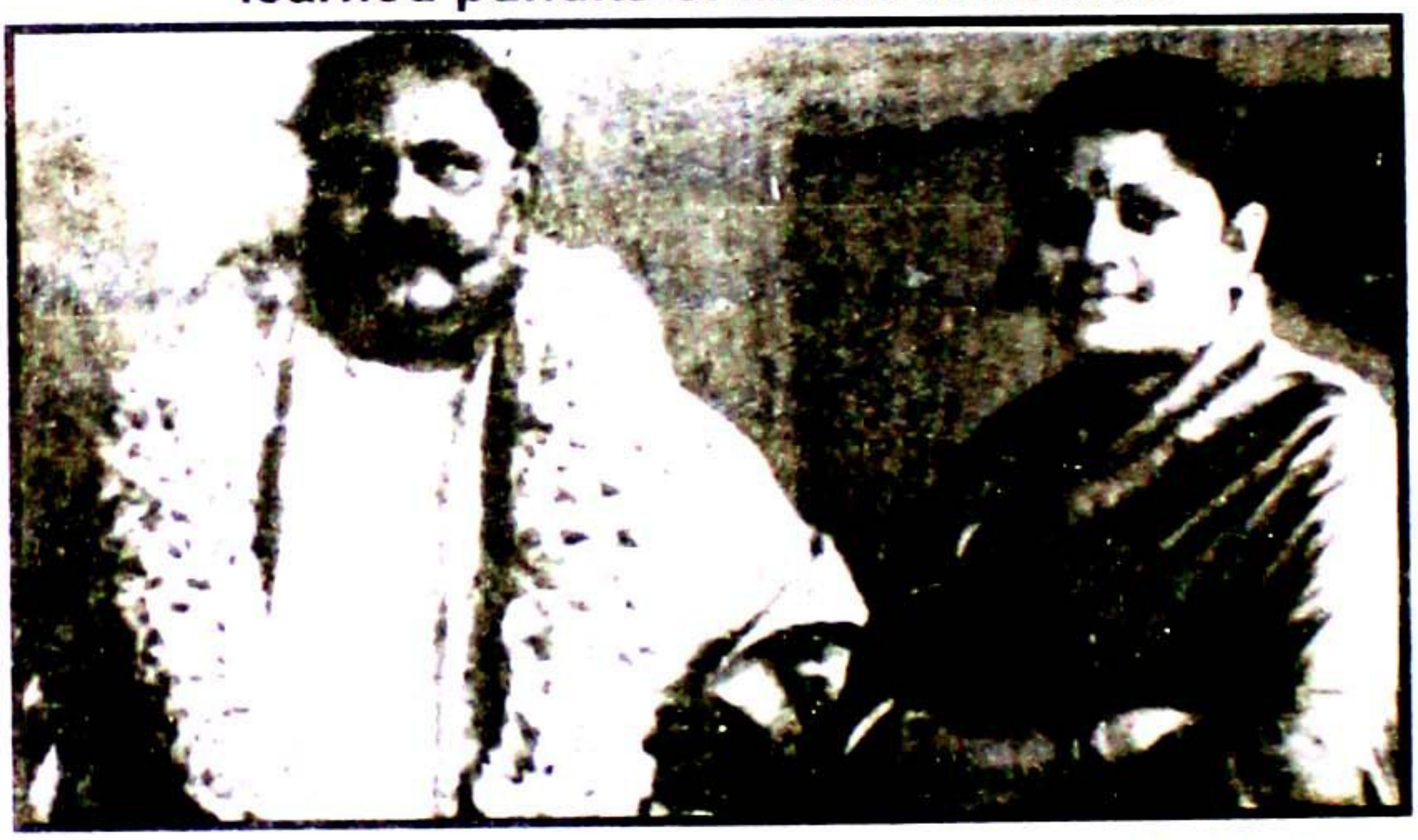

Bade Ghulam Ali Khan and M.S. Subalakshmi in Madras

خان صاحب مسکراتے ہوئے بولے ''پنڈت جی! اس راز کو سمجھنے کے لئے آپ مجھے اپنے سکول میں گانے کے لئے بلائیں۔''

پروفیسر بی۔آر۔ ڈیودھر نے خوشی خوشی اپنے سکول میں ایک بڑی محفل موسیقی کا اہتمام کیا جس میں موسیقی کے رسیا' نقاد اور ماہرین فن بڑی تعداد میں موجود تھے۔ خان صاحب کو گاتے سن کر وہ سب حیران رہ گئے۔ آواز کے استعمال پر خان صاحب کو جو قدرت حاصل تھی' بڑے بڑے گلوکار اس کمال سے محروم نظر آتے تھے۔ وہ ایک

Marfat.com

خاص ترتیب کے ساتھ پیٹ' پھیپھڑوں اور آواز کی نالیوں سے مطلوبہ زیر و بم کے ساتھ آواز نکالنے پر اس طرح قادر تھے کہ کسی کا اس درجہ کمال کو پہنچنا مشکل نظر آتا تھا۔ محفل کے اختتام پر خان صاحب نے موسیقی کے طلباء کو ساز اور آواز کے رموز کے بارے میں بہت کچھ بتایا۔ پروفیسر بڈیودھر کو اپنے ایک نہایت باصلاحیت شاگرد شیو پترا کوم کالی پر بہت فخر تھا۔ وہ واقعی بہت عمدہ گویا تھا۔ پروفیسر صاحب نے یہ خواہش ظاہر کی کہ خان صاحب اس نوجوان کو اپنی شاگردی میں لے لیں۔ شیو پترا نہایت دبلا پتلا نوجوان تھا۔ خان صاحب اس کا سرتاپا جائزہ لے کر ہنس کر بولے "یہ میرے ریاض کی سختیاں نہیں سہہ سکے گا۔ میرا شاگرد بننے کے لئے اچھے گلے' بے پناہ صلاحیت اور لگن کے ساتھ ساتھ شیر جیسی جان بھی چاہیے۔"

خان صاحب کو برصغیر کے ہر علاقے کی منظوم فوک داستانوں اور صوفیانہ کلام گانے سے بھی دلچسپی تھی اور انہوں نے ہر میدان میں طبع آزمائی کے ساتھ نئے نئے تجربات بھی کیے تھے۔ خان صاحب ابھی بمبئی میں ہی تھے کہ انہیں مدراس سے موسیقی کے ایک اور بہت بڑے ماہر جی۔ این بالاسبرا مانیم نے اپنے ہاں گانے کی دعوت دی۔ خان صاحب کو اس سے پہلے ساؤتھ میں گانے کا موقع نہیں ملا تھا۔ اس لئے انہوں نے یہ دعوت فوراً قبول کر لی۔ ساؤتھ والے تو نارتھ کے گانے والوں کو بھی خاطر میں نہیں لاتے تھے' چہ جائیکہ پنجاب سے ایک نوجوان گویا آرہا تھا ..... مگر خان صاحب نے مدارس میں بھی محفل لوٹ لی۔ جی این بالاسبرا مانیم نے محفل کے اختتام پر انہیں شال پیش کی اور انہیں "سنگیت سمراٹ" کا خطاب دیا گیا۔ شوبھالکشمی جنہیں ساؤتھ کی سب سے بڑی اپسرا کا خطاب ملا ہوا تھا' وہ بھی اس محفل میں موجود تھیں۔ اس کے بعد انہیں ساؤتھ میں متعدد مقامات پر گانے کے لئے مدعو کیا گیا۔ یوں گویا وہ ساؤتھ اور نارتھ کی موسیقی کی دنیا کے درمیان ایک پل بن گئے۔ وہ ہر علاقے'

Marfat.com

زبان، رنگ، نسل اور مذہبی عقیدے کے لوگوں کو متاثر کرنے کا فن جانتے تھے۔

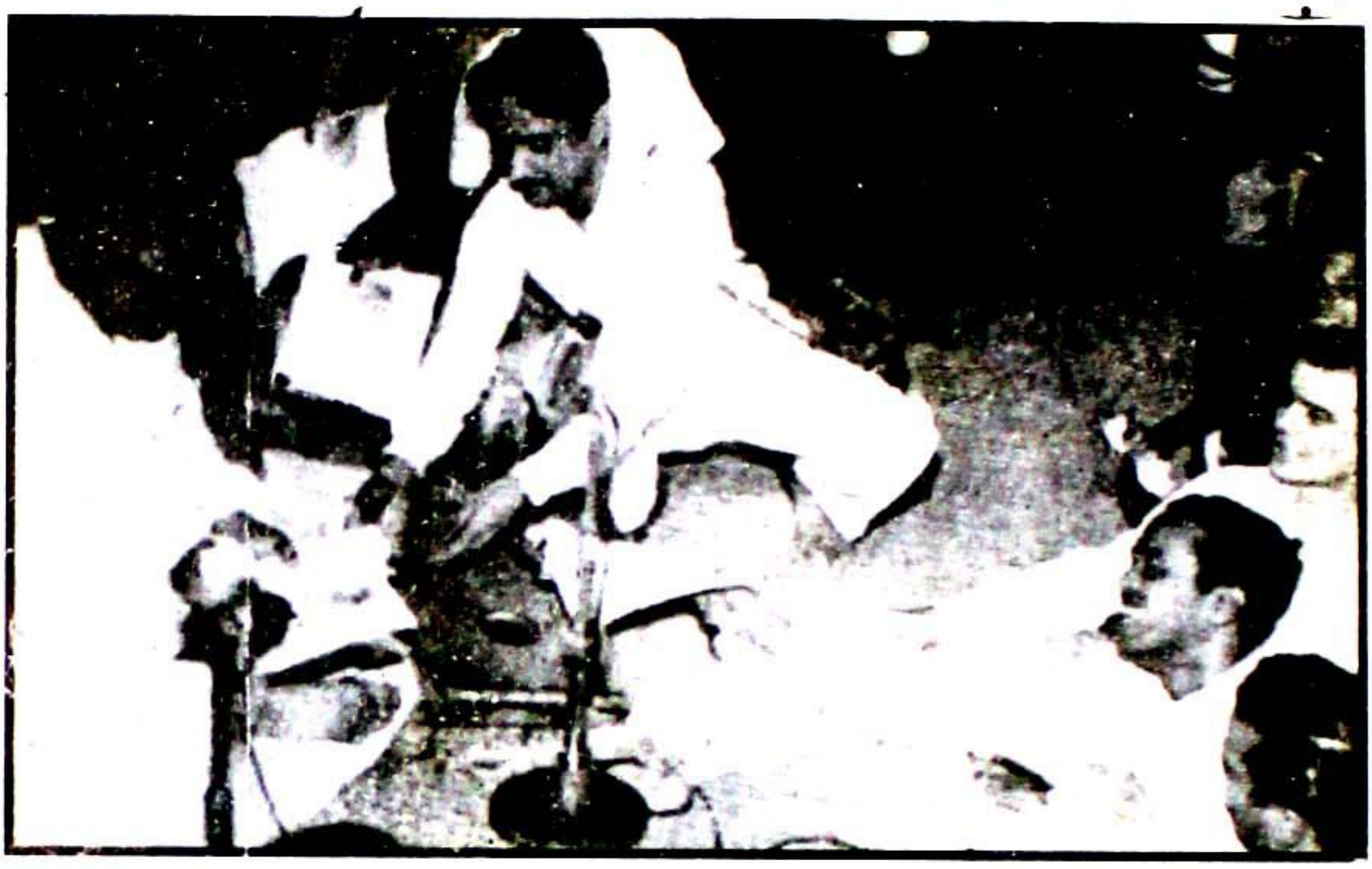

Bade Ghulam Ali Khan Sahib autographs brochures of a concert in Madras

شہر در شہر سفر کرنے اور بہت سی محفلوں میں اپنے فن کا جادو جگانے کے بعد بڑے غلام علی خان صاحب ایک بار پھر لاہور روانہ ہوئے۔ ہمیشہ کی طرح ان کی واپسی کی خبر سن کر ان کے ہاں دوستوں، مداحوں اور ضرورت مندوں کا تانتا بندھ گیا۔ وہ جو کچھ بھی کما کر لائے تھے، اس میں سے حسب معمول اور حسب توفیق انہوں نے سب کی مدد کی کچھ عرصہ لاہور میں رہنے کے بعد وہ اپنے آبائی شہر قصور بھی گئے۔ وہاں بھی لوگوں سے ملنے ملانے، پرانے شناساؤں کے ساتھ یادیں تازہ کرنے کے علاوہ ان کی ایک بڑی مصروفیت، تمام درگاہوں پر حاضری دینا بھی ہوتا تھا۔

وہ کہتے تھے ''میرے پاس اپنا تو کچھ بھی نہیں ہے۔ جو کچھ ہے ..... اللہ تعالیٰ کی دین اور ان بزرگوں کا فیض ہے۔''

قصور میں وہ ان تمام جگہوں پر بھی جاتے جہاں ان کا بچپن اور لڑکپن بیتا تھا اور جن کے ساتھ خان صاحب کی ان گنت یادیں وابستہ تھیں۔ ایک ماہ قصور میں رہنے کے بعد خان صاحب لاہور واپس روانہ ہوئے۔

Marfat.com

افغانستان میں محفل موسیقی

افغانستان کے شاہ، ظاہر شاہ مشرقی موسیقی سے خصوصی دلچسپی رکھتے تھے اور ہندوستان کی تقسیم سے پہلے ہی سے اس خطے کے معروف اور ممتاز فنکاروں کو اپنے ہاں مدعو کرنا ان کی روایت بن چکا تھا۔ پاکستان بننے کے بعد بھی یہ روایت قائم رہی اور دونوں ہی ملکوں سے بلند پایہ فنکار ان کے ہاں جاتے رہے اور شاہی محل میں حاضرین سے اپنے فن کی داد پاتے رہے۔ ویسے بھی افغانی اور ہندوستانی موسیقی میں بہت سی باتیں مشترک اور دونوں جگہ بعض سازوں میں مشابہت بھی رہی ہے۔ اس کے علاوہ وقت کے ساتھ دونوں ملکوں نے ایک دوسرے کے بعض ساز اپنائے بھی ہیں۔ مثلاً افغانستان کا رباب اور سنتور ہندوستان کے سازوں میں بھی شامل ہوا۔ طبلہ فارسی کے لفظ ''طبل'' سے بنا ہے جس کے معنی ڈھول ہیں۔ افغانستان میں فارسی ہی بولی جاتی ہے۔ لفظ ''ستار'' بھی فارسی سے ہی آیا ہے جس کے معنی ''سات تار'' ہیں۔ ان کا ساز ''دلربا'' ہندوستانی سارنگی کی ذرا لمبی شکل ہے۔ ہمارا تان پورہ اور ان کا طنبورہ کم و بیش ایک ہی چیز ہے۔ فارسی میں اس کے بارے میں ایک کہاوت بھی ہے ''من چہ می سرایم وطنبورہ من چہ می سراید۔'' یعنی ''میں کیا گا رہا ہوں اور میرا طنبورہ کیا گا رہا ہے۔ یہ کہاوت عام طور پر اس وقت استعمال ہوتی ہے جب کہیں سُر پن کا مظاہرہ کیا جا رہا ہو،

Marfat.com

گویئے اور اس کے سازوں میں کوئی تال میل نہ ہو۔

Begum Allah Rakhi - from Pathankot near Jammu

1947ء میں ظاہر شاہ نے بڑے غلام علی خان صاحب کو افغانستان آنے کی دعوت دی اور جب وہ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ وہاں پہنچے تو ان کا نہایت شاہانہ استقبال کیا گیا اور انہیں بڑی عزت و تکریم دی گئی۔ اس کا ایک ثبوت یہ تھا کہ جب وہ شاہی دربار میں گانے کے لئے آئے تو ان کا تعارف ''موسیقی کے بادشاہ'' کے لقب کے

Marfat.com

ساتھ کرایا گیا۔ محفل دن چڑھے ہی شروع ہو گئی تھی اور اس کا اختتام سہ پہر کو ایک پرتکلف ضیافت پر ہوا۔

محفل کے دوران ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ خان صاحب سنگ مرمر کے محل کے عظیم الشان ہال میں آراستہ محفل میں گا رہے تھے۔ محفل کا باغ قریب ہی تھا جس میں شاہ کا ذاتی چھوٹا سا چڑیا گھر موجود تھا۔ اس میں شاہ کے پسندیدہ بہت سے چرند پرند اور درندے موجود تھے۔ وہاں سے ایک سفید مور نکل کر کسی طرح سامعین کے درمیان آن پہنچا۔ کچھ دیر وہ خاموش اور ساکت کھڑا گویا محویت سے گانا سنتا رہا۔ پھر اس نے پر پھیلائے اور ناچنا شروع کر دیا۔ سنگیت کی طاقت کے اس غیر معمولی مظاہرے پر تمام حاضرین اور خود شاہ محمد ظاہر شاہ بھی دم بہ خود رہ گئے۔ کہا یہی جاتا ہے کہ سچی اور صحیح موسیقی درندوں تک پر اثر انداز ہوتی ہے اور ان کا رویہ پالتو جانوروں جیسا ہو جاتا ہے۔ غلام علی خان ایسے فنکار تھے جنہوں نے اس خیال کو درست ثابت کر دیا۔

محمد ظاہر شاہ ان سے اتنے متاثر ہوئے کہ انہوں نے خان صاحب کو نہایت اعلیٰ عہدے کے ساتھ شاہی دربار سے وابستہ ہونے کی پیشکش کی۔ خان صاحب اگر یہ پیش کش قبول کر لیتے تو تمام معاشی مسائل سے آزاد ہو کر آسودہ حالی کی زندگی بسر کر سکتے تھے۔ کیونکہ انہیں گھر، زمین اور بھاری مراعات حاصل ہوتیں ..... لیکن انہوں نے یہ کہہ کر نرمی سے معذرت کر لی کہ لاہور میں ان کی بیوی اور بچے بے چینی سے ان کی واپسی کا انتظار کر رہے ہیں۔

Marfat.com

بیگم اللہ رکھی سے شادی

خان صاحب ابھی کابل ہی میں تھے کہ پیچھے تقسیم کے ہنگامے پھوٹ پڑے۔ لاہور جیسا پرامن شہر بھی ان سے محفوظ نہ رہا۔ دریائے راوی خون کے دریا میں تبدیل ہونے لگا۔ بیشتر بڑے فنکاروں کی طرح خان صاحب بھی اپنی دنیا میں مگن رہنے والے انسان تھے۔ انہوں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ حالات اس طرح پلٹا کھائیں گے ..... انسان اس طرح انسان کے خون کا پیاسا ہو گا اور وحشت و بربریت میں درندوں کو بھی پیچھے چھوڑ جائے گا۔ وہ سڑک کے راستے اپنے ساتھیوں کے ہمراہ کار میں ملتان پہنچے تو انہیں سڑک کے دونوں طرف کھیتوں میں لاشیں بری حالت میں پڑی نظر آئیں۔ ٹرینوں کو آگ لگائی جا رہی تھی اور پنجاب میں خانہ جنگی کا سا سماں تھا۔ ادھر ہندوستان سے ہجرت کر کے آتے ہوئے مسلمان ظلم و تشدد کا نشانہ تھے اور ادھر پاکستان سے جاتے ہوئے ہندو اور سکھ اسی قیامت سے گزر رہے تھے۔ پنجاب دو حصوں میں تقسیم ہو چکا تھا اور سب سے زیادہ خونریزی اسی منقسم صوبے میں ہو رہی تھی۔ دونوں طرف سے متاثرین کو نکال کر محفوظ مقامات پر پہنچانے کی کوشش کی جا رہی تھی جو زیادہ کامیاب نہیں ہو رہی تھی۔ خان صاحب بہرحال کسی نہ کسی طرح ملتان سے لاہور پہنچ گئے اور انہوں نے یہ دیکھ کر اطمینان کی سانس لی کہ کوچہ کشمیریاں میں ان کا

Marfat.com

کنبہ اپنے مکان میں محفوظ تھا۔

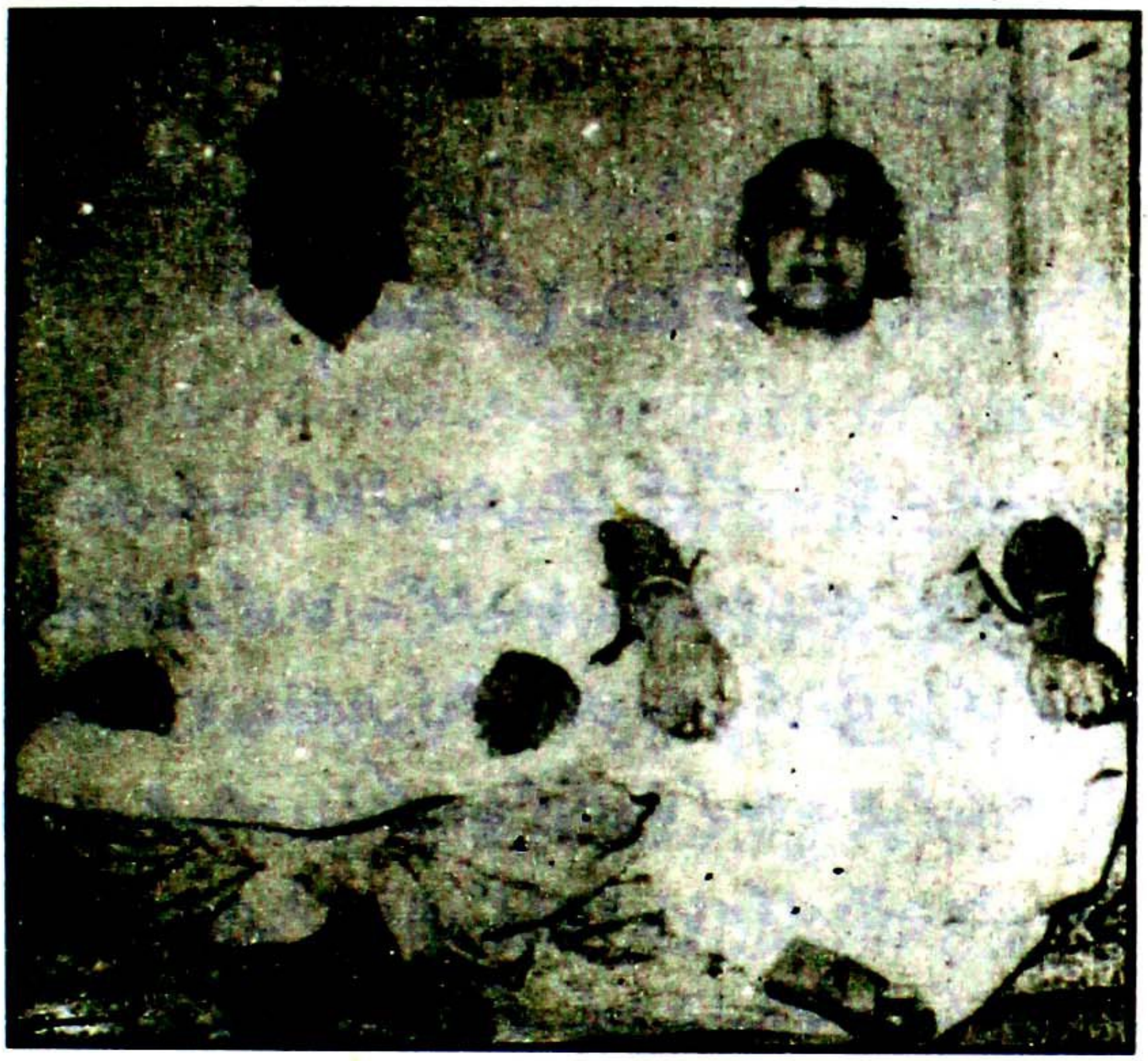

Khan Sahib's marriage to Allah Rakhi Begum

ہندوستان آزاد تو ہو گیا تھا لیکن سیاسی مدوجزر اور کشمکش، تقسیم کی خونریزی اور معاشرتی شکست وریخت ادیبوں، شاعروں، مصوروں، موسیقاروں اور دیگر فنکاروں کو خون کے آنسو رلا رہی تھی۔ یہ سب چیزیں ان کے لئے بہت بھیانک تھیں۔ ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ انہیں کبھی ایسا وقت بھی دیکھنا پڑے گا۔ وہ تو ویسے ہی اس نظریے کے قائل تھے کہ فن کی کوئی سرحد نہیں ہوتی، اسے لکیروں کے ذریعے تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ وہ اپنی ذات اور اپنے فن میں مگن رہنے والے لوگ ہوتے ہیں لیکن اب انہیں بھی سیاست اور معاشرت کے خوفناک کھیل دیکھنے پڑ رہے .....

Marfat.com

تھے۔ اب تک خان صاحب کے بیٹوں کی پرورش خادم حسین کے ہاں ہو رہی تھی جو ان کی مرحومہ بیوی کے بھائی اور ان کے بہنوئی بھی تھے۔ لیکن اب وہ کراچی منتقل ہو گئے تھے اور خان صاحب کے لئے بچوں کی پرورش اور دیکھ بھال کا مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ انہوں نے اب اپنے گھر بار اور ایک ایسی ہستی کی ضرورت محسوس کی جو ان کا ..... اور ان کی عدم موجودگی میں ان کے بچوں کا خیال رکھ سکے۔ ان کے قریبی دوست' جو ان کے طبلہ نواز بھی تھے' انہوں نے خان صاحب کے لئے ایک خوبصورت کشمیرنی لڑکی کا رشتہ تجویز کیا جس کا گھر پٹھان کوٹ کے قریب دینا نگر میں تھا۔ اس کا نام اللہ رکھی تھا اور اس وقت اس کی عمر تیس سال کے قریب تھی۔ وہ نوجوانی میں بیوہ ہو گئی تھی تاہم اس کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ اس نے خان صاحب سے شادی پر رضا مندی ظاہر کر دی۔ یوں ایک بار پھر خان صاحب کا گھر آباد ہو گیا جس پر وہ خاصے خوش تھے۔ انہوں نے اب کوچہ پیر جیلانیاں میں میاں خان کی حویلی کے قریب مکان کرائے پر لے لیا۔

خان صاحب نے کافی طویل عرصے رنڈوے پن کی زندگی گزاری تھی۔ دوسری بیوی کے ساتھ ان کی اچھی نبھنے لگی اور وہ اصرار سے انہیں ہر وقت ساتھ رکھنے لگے۔ دوسرے شہروں کے دوروں پر بھی وہ انہیں ساتھ لے جانے لگے۔ جلد ہی اللہ رکھی کی جھجک بھی ختم ہو گئی اور انہوں نے ایک مشہور و مقبول شخص کی شریک حیات کے طور پر زندگی گزارنا سیکھ لیا۔ ان کے گھر کے دروازے گویا ہر وقت کھلے رہتے تھے۔ مہمانوں اور شاگردوں کی آمدورفت جاری رہتی تھی۔ اس کے باوجود اللہ رکھی نے گھر کو نہایت سلیقے قرینے سے رکھا ہوا تھا۔ بچوں کی پرورش اور نگہداشت بھی وہ نہایت عمدگی اور ذمے داری سے کر رہی تھیں۔ گھر آنے والوں کی مدارت اور تواضع کا بھی وہ خیال

Marfat.com

رکھتی تھیں۔ گوکہ اس زمانے میں خان صاحب کی آمدنی زیادہ نہیں تھی لیکن انہوں نے مہمانداری اور گھر کے اخراجات میں کبھی کنجوسی نہیں کی اور نہ ہی اپنے فیاضانہ طور طریقوں سے ہاتھ کھینچا۔ ان کا کہنا تھا کہ ان کی ضروریات پوری کرنے کے معاملے میں اللہ ان پر مہربان ہے اور وہ اس سلسلے میں کبھی فکر مند نہیں ہوتے۔ ان کا گھرانہ ہنسی خوشی زندگی گزارتا دکھائی دیتا تھا۔

.....☆.....

Marfat.com

تقسیمِ ہند

ہندوستان کی تقسیم فنکاروں کے لئے بڑا صدمہ اور برصغیر کی رنگا رنگ .....مگر متحد اور مشترک ثقافت کے لئے بہت بڑا دھچکا تھی۔ ملک کی تقسیم کے ساتھ بعض لوگوں نے گویا آرٹ کو بھی تقسیم کرنا شروع کر دیا تھا اور موسیقی میں بھی اپنی پسند کے حصے تلاش کرنا ..... یا اس کی نئی تعریف متعین کرنے کی کوششیں شروع کر دی تھیں۔ زیڈ۔ اے بخاری بھی اسی قسم کے لوگوں میں سے ایک تھے۔ وہ پاکستان میں لاہور ریڈیو اسٹیشن پر تعینات تھے اور ڈائرکٹر جنرل ریڈیو پاکستان تھے۔ انہوں نے اپنی ملازمت کا آغاز اس طرح کیا کہ ریڈیو پر ٹھمری' دادرا وغیرہ پر پابندی لگا دی۔ اس کے علاوہ ایسے راگوں کو بھی ممنوع قرار دینا شروع کر دیا جن کے نام ہندوانہ تھے۔ اس کے بعد نوبت یہاں تک آئی کہ خیال اور ایسی بندشیں گانا بھی ممنوع قرار پایا جن میں ہندوؤں کے دیوتاؤں یا دیویوں کے نام آتے تھے۔ ایک بار استاد بڑے غلام علی خان صاحب ریڈیو پر ایک پروگرام میں پیش کیا جس میں انہوں نے اپنی تیار کی ہوئی ایک بندش میاں کی توڑی میں گائی جس کے بول کچھ یوں تھے:

اب	مورے	رام
رام	دعا	دیا

Marfat.com

برہمن رام رام

دیاؔ او مو پے

تم ایسے دیاؔ ندھ

ہم چھیری تم رام سیام

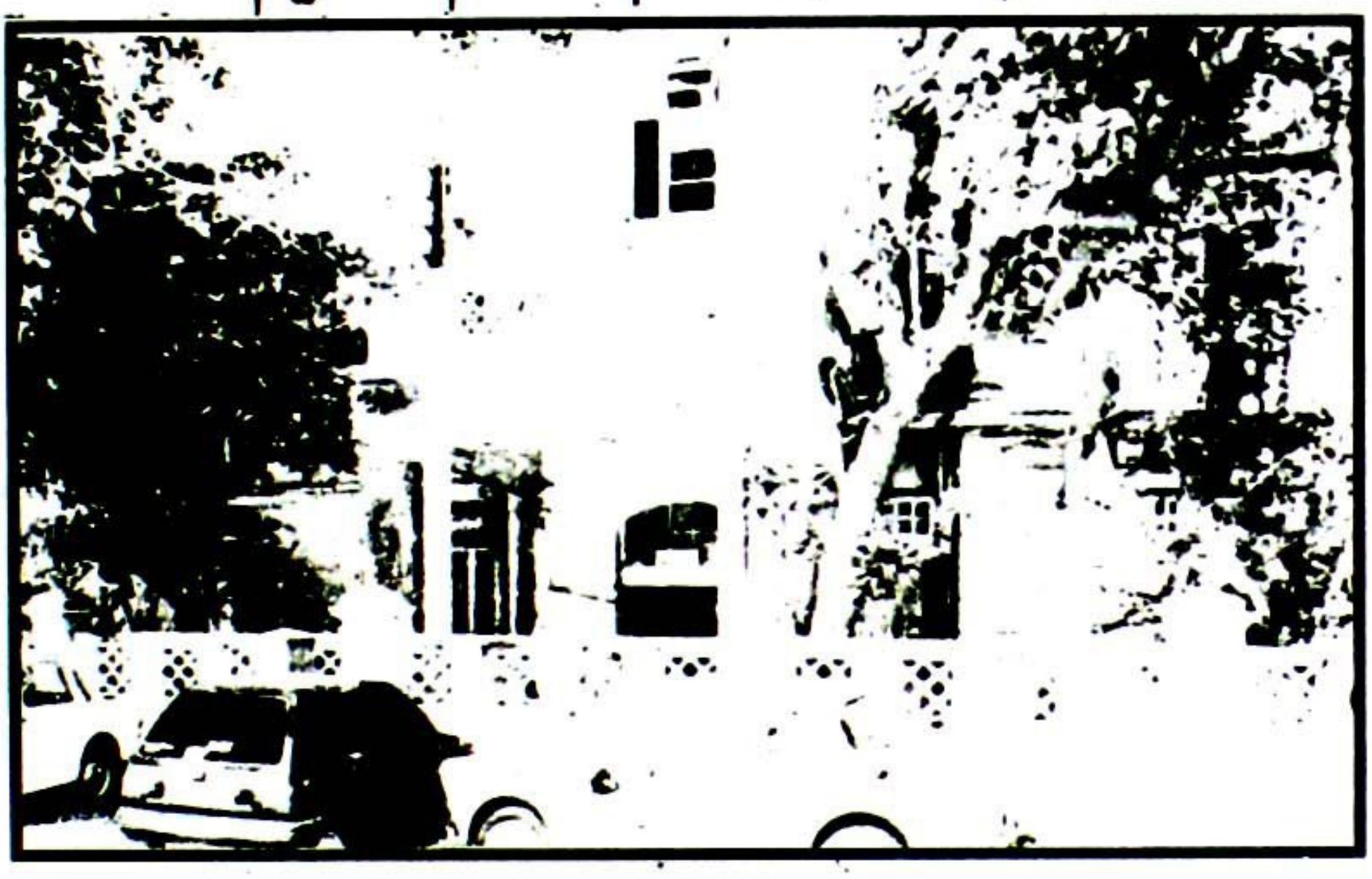

Himmat Niwas - Dongarsi Road on Malabar Hill - Bombay

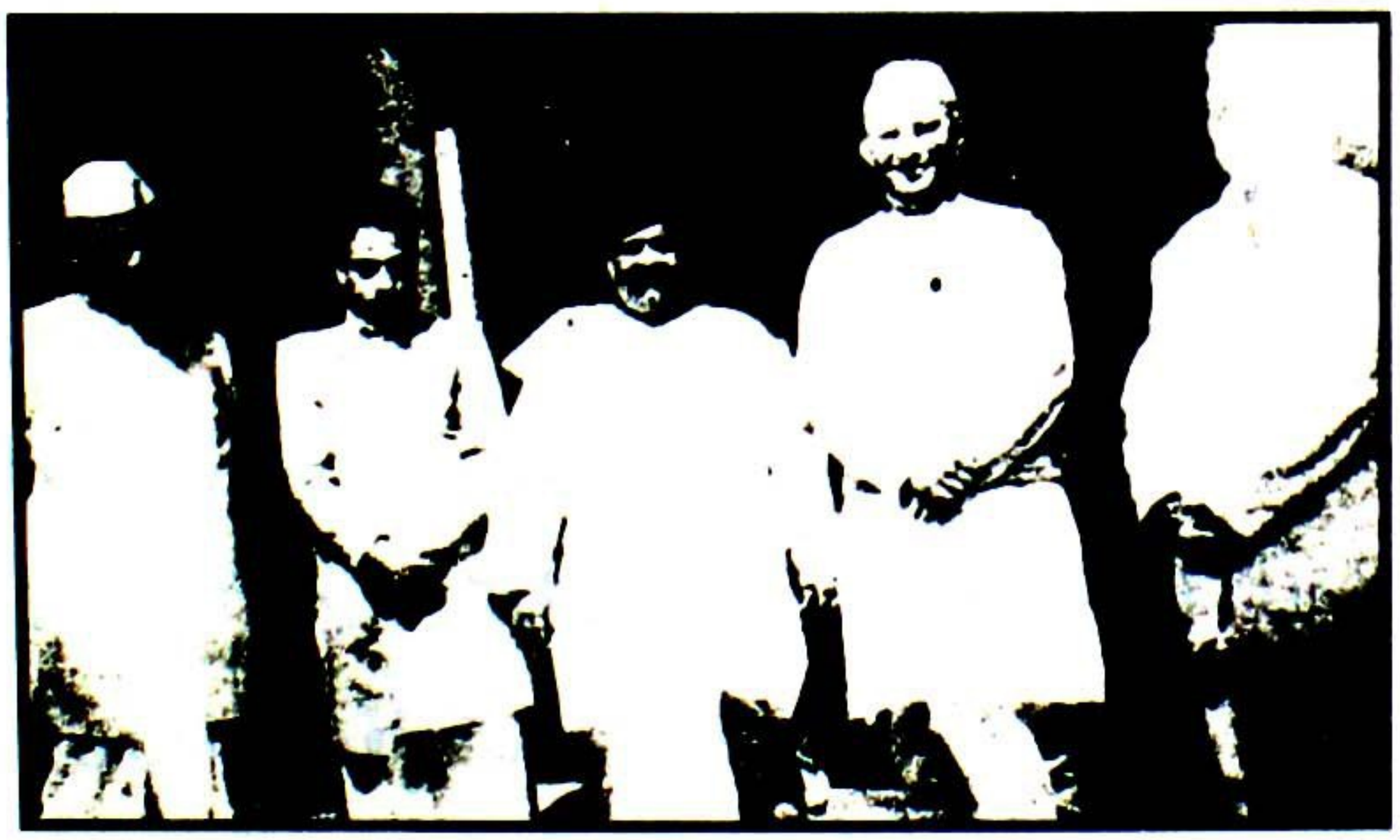

اس کا مفہوم یہ تھا ''رام ہی میری ڈھارس ہیں .... میں آپ کی ماننے والی ہوں .... اب مجھ پر رحم کرو ....'' جب خان صاحب اسٹوڈیو سے باہر

Marfat.com

آئے تو بخاری صاحب بولے ''خان صاحب! یہ آپ نے رام رام کیا لگا رکھی ہے؟ اب آپ رحیم کریم گایا کریں۔''

خان صاحب مجروح لہجے میں بولے ''بخاری صاحب! آپ روائتیں نہیں بدل سکتے۔ روایتی بندشیں جس طرح چلی آ رہی ہیں' اسی طرح گائی جاتی ہیں۔ بہر حال .....آپ اس سلسلے میں پریشان نہ ہوں۔ میں آئندہ آپ کے ریڈیو اسٹیشن کے لئے نہیں گاؤں گا۔ آپ میرا نام ریڈیو پاکستان کے سنگرز کے پینل سے کاٹ دیں۔''

L to R Begum Karamat Ali - Begum Allah Rakhi Munawar Ali,
Bade Ghulam Ali Khan and Karamat Ali - in Himmat Niwas, Bombay

اس کے بعد بڑے غلام علی خان صاحب نے کبھی ریڈیو پاکستان لاہور کا رخ نہیں کیا۔ 1951ء میں وہ لاہور ہی میں تھے جب انہیں انڈیا سے مرار جی ڈیسائی کے

Marfat.com

گھر پر گانے کی دعوت ملی' جو اس وقت مہاراشٹر کے وزیراعلیٰ تھے۔ خان صاحب نے یہ دعوت قبول کر لی اور بمبئی چلے گئے۔ وہاں وہ اپنا استقبال دیکھ کر حیران رہ گئے۔ انہیں امید نہیں تھی کہ وہاں موسیقی کے شائقین کی تعداد زیادہ ہونے کے باوجود لوگ پاکستان کے ایک گویئے کا اس طرح استقبال کریں گے۔ مداحوں کی عقیدت اور جوش و خروش دیکھ کر مرار جی ڈیسائی نے ان سے کہا۔ ''خان صاحب! آپ انڈیا ہی میں کیوں نہیں رہ جاتے ..... جہاں آپ کے ایسے چاہنے والے اتنی بڑی تعداد میں موجود ہیں؟''

''پاکستان کا نگینہ انڈیا کا کوہ نور بن گیا''۔

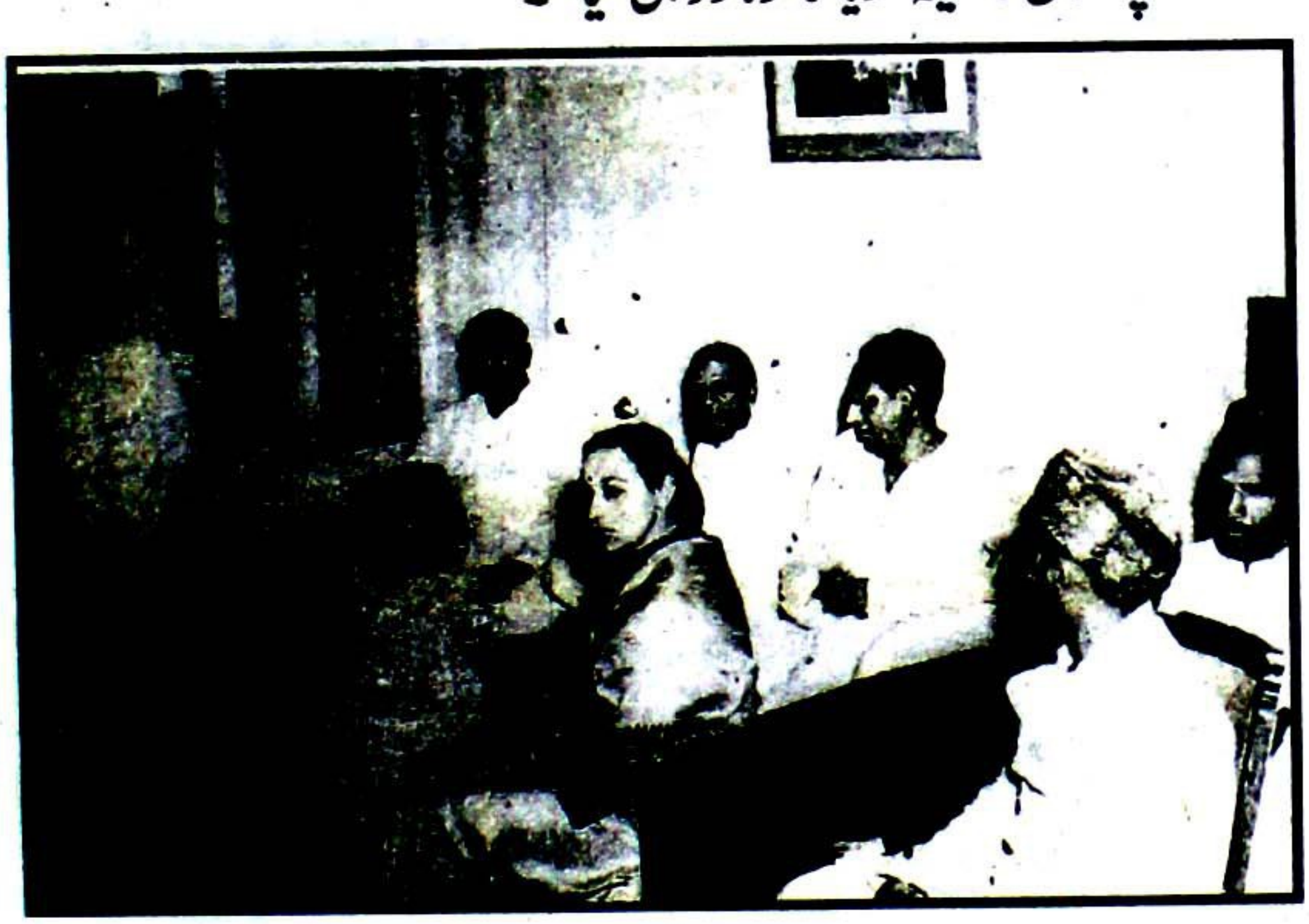

At home - L to R - 2nd Brij Narain, Bade Ghulam Ali Khan, 5th from left - Ustad Amir Khan Sahib

جواہر لال نہرو' جو بہ ذات خود فنکاروں کے بہت بڑے قدر دان تھے' انہوں نے 1954ء میں خصوصی طور پر بڑے غلام علی خان کی شہریت کے احکام جاری کیے۔ بعد میں خان صاحب لاہور سے اپنی فیملی کو بھی لے آئے اور انہوں نے ایک بار پھر ڈونگارسی روڈ پر تین بتی کے قریب ''ہمت نواس'' میں ایک فلیٹ کرائے پر لئے لیا۔ رفتہ

Marfat.com

رفتہ دوستوں اور مداحوں کا حلقہ بڑھنے لگا اور وہ ایک بار پھر ہندوستانی موسیقی کے افق کا ایک درخشاں ستارہ بن گئے۔ اس افق پر گوکہ پہلے ہی سے ایک کہکشاں جگمگا رہی تھی جس میں پنڈت اوم کرناتھ' قیصر بائی اور اس کے استاد اللہ دیا خان' ہیرا بائی بروڈ کر' پدم وتی شیلی گرام' اور عہد ساز موسیقار عبدالکریم خان صاحب کی صاحبزادیاں شامل تھیں۔ ایک اور کہکشاں بھنڈی بازار گھرانے کے فنکاروں کی بھی تھی جس میں کالے نذیر خان' امان علی خان' جھجھو خان اور دوسرے کئی نام شامل تھے۔ ان کے علاوہ آگرہ گھرانے کے فنکار بھی تھے۔ غرضیکہ بمبئی میں موسیقی کی دنیا خوب آباد تھی۔ خان صاحب کے گھر میں اکثر میلے کا سماں رہتا۔ بیگم اللہ رکھی اکثر کچن میں مہمانوں کے لئے پکوڑے' کچوریاں' چائے وغیرہ بناتی نظر آتیں۔ خان صاحب کے لئے زندگی کی خوشی گانے بجانے اور لوگوں سے ملنے ملانے میں ہی تھی۔ گانے بجانے سے دلچسپی رکھنے والے ہر رنگ' ہر نسل' ہر مذہب اور ہر خطے کے لوگ ان کے ہاں آتے تھے۔ وہ صرف موسیقی کے رشتے میں بندھے ہوئے تھے۔ وہاں موسیقی کی باتیں ہوتیں' ایک دوسرے کو سنا جاتا' سنایا جاتا۔ موسیقی کی باریکیوں پر باتیں ہوتیں۔ کبھی کبھی ان محفلوں میں خان صاحب اپنے کمسن پوتوں کو بھی بلا لیتے اور انہیں ''سا ..... رے ..... گا ..... ما ..... پا'' سکھاتے۔

بمبئی اس زمانے میں بھی فلم انڈسٹری کا گڑھ تھا۔ راج کپور اور نرگس کی فلمیں بے حد مقبول تھیں۔ نرگس کی والدہ جدّن بائی کلاسیکل گانے والوں میں گویا نوابی محفلوں میں مخصوص شاہانہ انداز کی گانے والی آخری شخصیت رہ گئی تھیں۔ ان کے دو سازندے سید صاحب اور میر صاحب فلم انڈسٹری میں جا کر کامیاب میوزک ڈائرکٹر

Marfat.com

بنے۔ جدّن بائی خود غلام علی خان صاحب کی بڑی مداح تھیں۔ انہوں نے راج کپور سے کہا کہ وہ خان صاحب کو ان کے ہاں محفل میں گانے کے لئے مدعو کریں۔ راج کپور نے خان صاحب کو یہ دعوت پہنچائی جو انہوں نے قبول کرلی۔

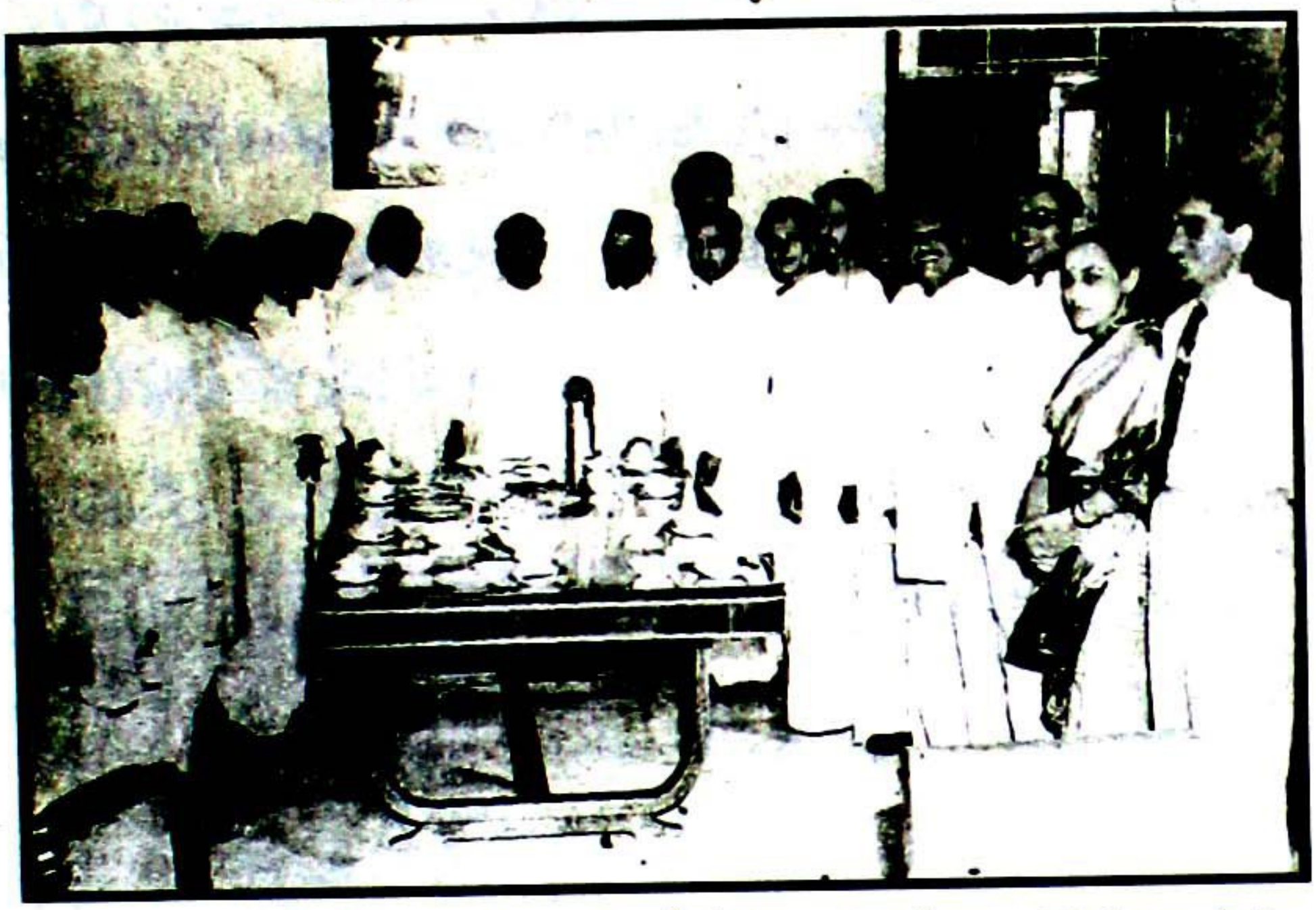

A tea party in Mumbai - Bade Ghulam Ali Khan - 8th from left

فلم انڈسٹری کی بیشتر سرکردہ شخصیات' مشہور فلم اسٹارز' ہدایتکار موسیقار وغیرہ اس محفل میں موجود تھے۔ نرگس بھی تھیں۔ سب ہی خان صاحب کو مبہوت ہو کر سنتے رہے۔ کسی راگ پر راج کپور اچانک بول اٹھے ''نہیں .....خان صاحب! یہ نہیں.....''

خان صاحب نے اس وقت تو سنی ان سنی کر دی اور گاتے رہے لیکن راج کپور نے جب دوبارہ اسی طرح دخل اندازی کی تو خان صاحب نے گرج دار آواز میں انہیں ڈانٹ دیا ''خاموش.....''

Marfat.com

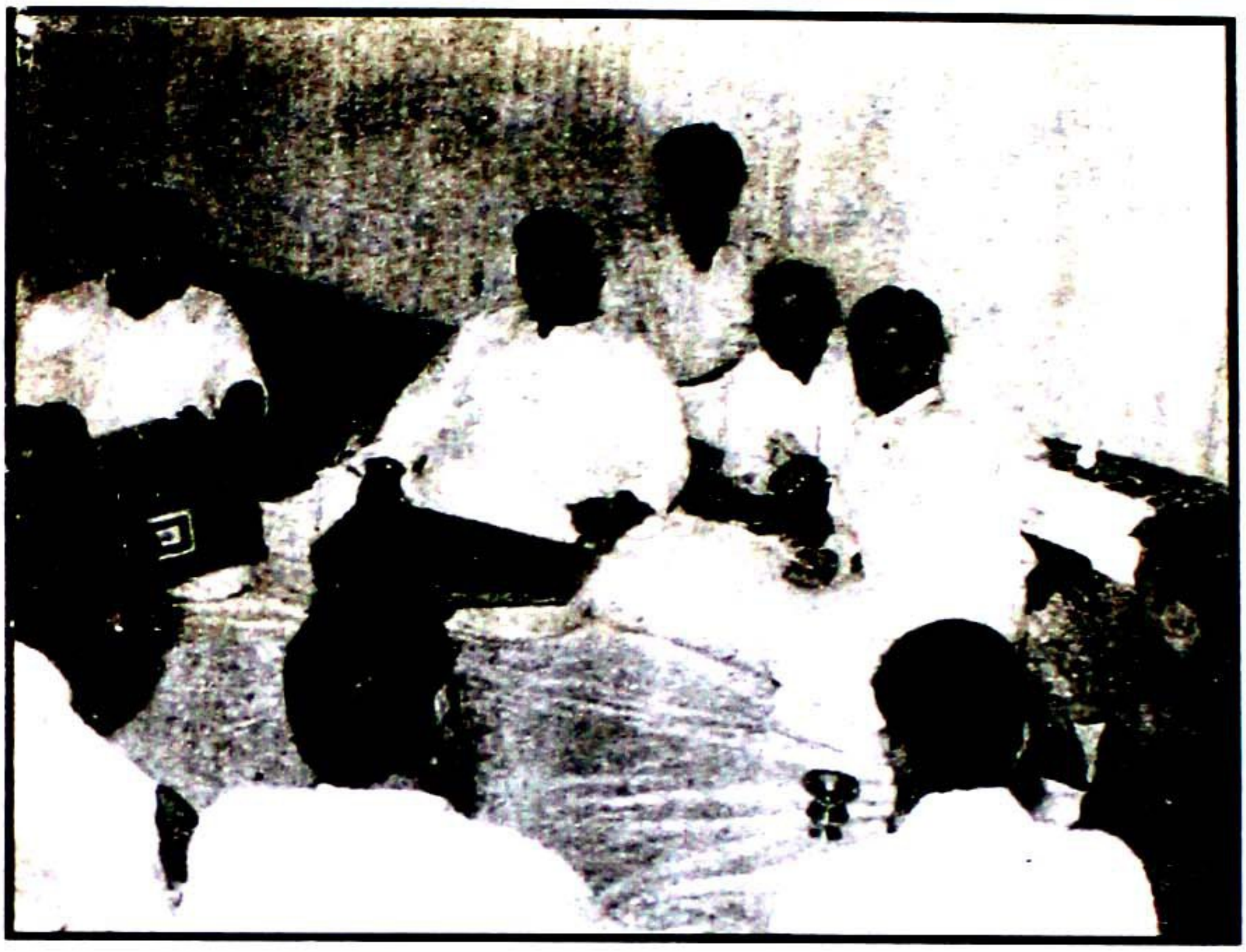

Bade Ghulam Ali Khan Sahib with Dilip Kumar

اس کے بعد راج کپور کو سانپ سونگھ گیا۔ اس وقت بالکل ایسا لگا جیسے کسی بارعب اور غصہ ور بزرگ نے کسی بدتمیز بچے کو ڈانٹ دیا ہو۔ جدّن بائی کے گھر پر منعقد ہونے والی یہ محفل یادگار تھی۔ اس کے بعد خان صاحب کو فلمی دنیا میں بھی بڑا مقام اور مقبولیت حاصل ہوگئی۔ شاید اس کا نتیجہ تھا کہ جب کے آصف نے تاریخی ..... اور تاریخ ساز فلم مغل اعظم بنائی تو تان سین کے کردار کے لئے یہیں پردہ گویئے کے طور پر انہیں بڑے غلام علی خان صاحب سے زیادہ موزوں آدمی کوئی نظر نہ آیا۔ بیشتر لوگ اس پس منظر سے واقف ہیں کے آصف کو اس فلم کی تیاری میں کتنا طویل عرصہ لگا ..... کس باریک بینی اور محنت سے انہوں نے یہ فلم بنائی اور کس طرح اس کی معمولی معمولی جزئیات پر بھی دماغ سوزی کی۔ فلم کیا تھی؟ گویا ایک انہونے خواب کی تعبیر تھی۔ کے آصف نے خان صاحب سے کہا "سر! میں نے اس فلم کو قابلِ دید بنانے کے لئے ہر

Marfat.com

کوشش کر ڈالی ہے۔ اب اگر آپ اس میں تان سین کے طور پر گا دیں گے تو یہ یادگار ہو جائے گی۔'' فلم میں جب شہزادہ سلیم (دلیپ کمار) جنگ میں فتح حاصل کر کے واپس آتا ہے تو اس کے راستے میں موتی بکھرتے ہیں۔ پس منظر میں تان سین کے گانے کی آواز آتی ہے۔ خان صاحب نے یہاں موتیوں کے بکھرنے کا تاثر سموتے ہوئے راگ رگیشری میں گایا ہے:

''شبھ دن آئے .....''

شہزادہ سلیم اور انارکلی (مدھوبالا) کی محبت کے مراحل کے درمیان ایک منظر میں خان صاحب کی ٹھمری سنائی دیتی ہے۔

''جوگن بن آئی.....''

یہ سین پہلے پکچرائز ہو گیا تھا۔ خان صاحب نے سین دیکھ کر گانا سوچا' تخلیق کیا اور فلم چلوا کر دیکھتے ہوئے ہر شاٹ کی مناسبت سے ریکارڈ کرایا تب وہ اس سے مطمئن ہوئے۔ اس سے پہلے گانا جس طرح پلے بیک سانگ کے طور پر ریکارڈ کیا گیا وہ خان صاحب کو اچھا نہیں لگا تھا۔

ان دنوں قسمت خان پر خوب مہربان تھی۔ ان کی مقبولیت عروج پر تھی۔ ہر طرف سے انہیں گانے کی دعوتیں ملتی تھیں۔ شہرت' روپیہ پیسہ اور گھریلو سکون ..... سبھی کچھ انہیں حاصل تھا ..... لیکن افسوس ..... یہ مثالی دور زیادہ طویل نہیں تھا۔

1961ء میں خان صاحب مہاراشٹر کے ایک چھوٹے سے شہر اکولا میں ایک میوزک فیسٹول میں گانے کے لئے گئے ہوئے تھے۔ گانے کے دوران ہی انہیں یوں لگا

Marfat.com

جیسے اچانک ان پر کسی بیماری کے حملہ کیا ہو۔ انہوں نے اپنے سازندوں سے کہا ''میرے ہاتھ حرکت نہیں کر رہے .....'' تاہم انہوں نے پروگرام پورا کیا۔ اس کے فوراً بعد انہیں جلد از جلد بمبئی لے جایا گیا اور بمبئی ہاسپٹل میں داخل کرایا گیا جہاں مشہور ہارٹ اسپیشلسٹ ڈاکٹر بالیگا نے ان کا علاج شروع کیا۔ وہ صاحب فراش ہو گئے۔ان کے جسم کے بائیں حصے پر فالج کا حملہ ہوا تھا جس سے ان کا دل بھی متاثر ہوا تھا۔ ڈاکٹروں نے انہیں ہلنے سے بھی منع کر دیا تھا۔

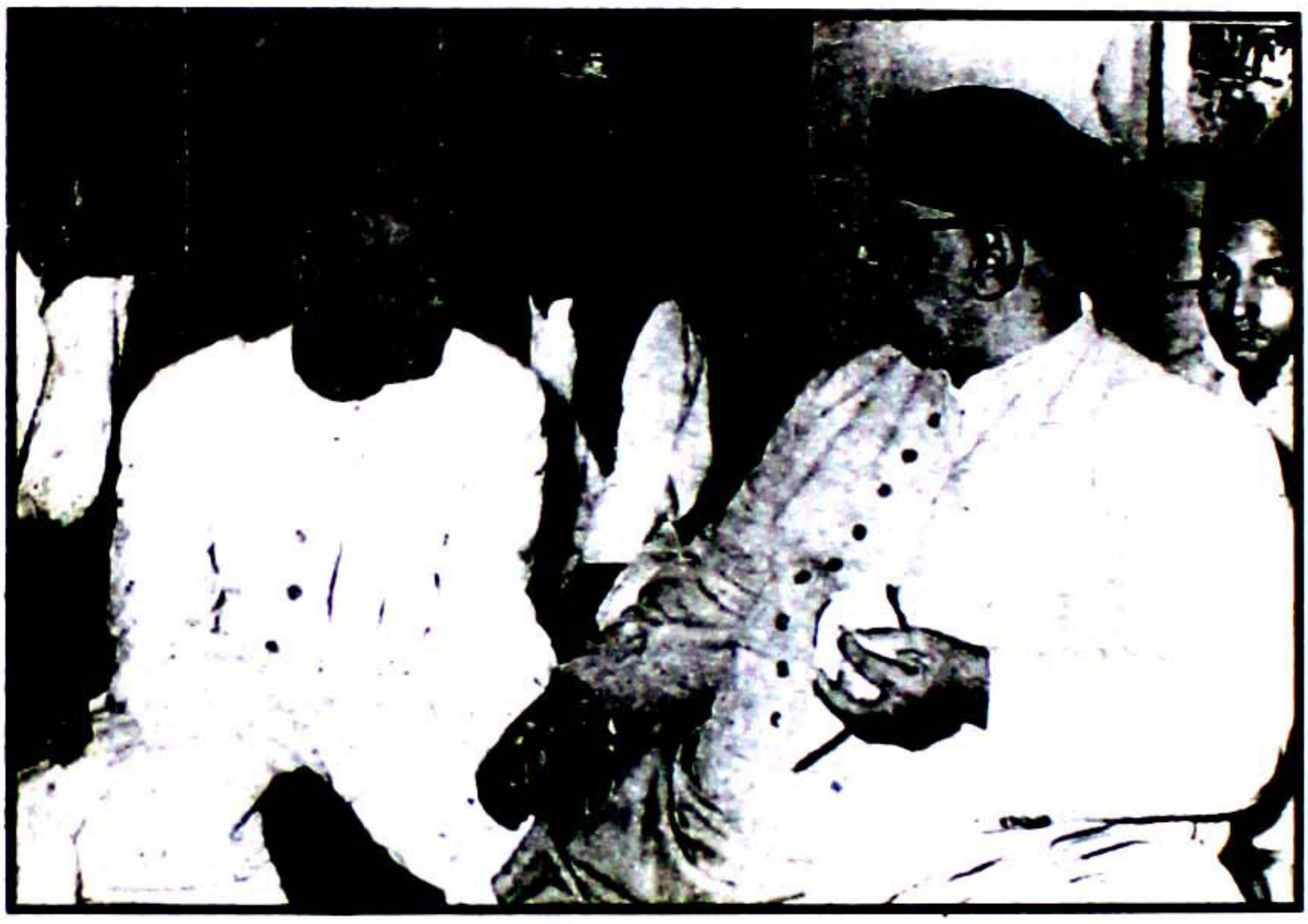

L to R Munawar Ali Khan, Ustad Rahimuddin Dagar, Bade Ghulam Ali Khan Sahib and his nephew Amir Ali

خان صاحب چونکہ ایک شاہ خرچ آدمی تھے اور ان کے ذمے ایک بڑے کنبے کی کفالت بھی تھی۔ اس لئے ان کے پاس بہت زیادہ جمع جتھا تو تھا نہیں ..... اور پھر علاج بھی مہنگا تھا۔ چنانچہ جو کچھ پلّے تھا وہ جلد ہی ختم ہو گیا۔ اپنے فن کے ذریعے کمانے والا جب خود ہی بستر پر گر جائے تو اس کا کوئی ذریعہء آمدن نہیں رہتا۔ خان صاحب بھی اس صورت حال سے دو چار تھے۔ اس موقعے پر فلم انڈسٹری ان کی مدد کے لئے اٹھ کھڑی ہوئی اور ان کے علاج کے لئے فنڈز اکٹھے کرنے کی غرض سے

Marfat.com

ایک بہت بڑی محفل ہوسیقی کا اہتمام کیا گیا۔

Himmat Niwas. It was believed that an evil spell was placed in the porch beyond the entrance

خان صاحب کا بستر پر گرنا ایسا ہی تھا جیسے ایک شیر کو پنجرے میں بند کر دیا گیا ہو اور وہ پنجرے میں بھی ادھر ادھر حرکت کرنے یا گرجنے کے قابل نہ ہو۔ سر سے

Marfat.com

پاؤں تک ان کے جسم کا آدھا حصہ بائیں طرف سے مفلوج تھا اور وہ بولنے سے بھی معذور ہو چکے تھے جبکہ گزشتہ پچاس برس سے روزانہ کئی کئی گھنٹے ریاض کرنا ان کا معمول تھا لیکن اب وہ گانے کی کوشش کرتے تو حلق سے کوئی آواز ہی برآمد نہ ہوتی۔ غلام علی جیسے انسان کے لئے یہ کتنی بڑی مجبوری تھی' یہ ان کا دل ہی جانتا ہو گا۔ بہر حال ..... یہ ایک جسمانی معذوری تھی۔ ان کی روح نے ابھی شکست نہیں مانی تھی۔ وہ گانے کی کوشش کرتے رہتے تھے۔ ان کے ڈاکٹر انہیں اس کوشش سے باز رہنے کی تلقین کرتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ گانے کی کوشش سے ان کے دل پر زور پڑے گا اور یہ چیز ان کی زندگی کے لئے خطرناک ثابت ہو سکتی ہے۔

اس پر خان صاحب نے اپنی نحیف اور شکستہ آواز میں جواب دیا۔ ''اور اگر میں گا نہیں سکتا تو پھر میں زندہ ہی نہیں رہنا چاہتا''۔

ان کے اہل خانہ کا خیال تھا کہ کسی دشمن یا رقیب نے ان کا کیریئر تباہ کرنے کے لئے ان پر کالا جادو کر دیا ہے اور شاید گھر کے کسی حصے میں کوئی تعویز دبایا گیا ہے۔ وہ اس جادو کا توڑ کرنے کی اپنی سی کوششوں میں لگے ہوئے تھے۔ خان صاحب نے ہسپتال سے ہی اپنی بہن اور بہنوئی کو کراچی پیغام بھیجا کہ وہ عظمت کو ساتھ لے کر بمبئی آجائیں۔ اس سے پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ جون 1944ء میں جب ان کی بہن کے ہاں بیٹی پیدا ہوئی تھی اور اس کا نام عظمت رکھا گیا تھا تو خان صاحب نے فیصلہ سنا دیا تھا کہ جب عظمت بڑی ہو گی تو وہ اس کی شادی اپنے بیٹے منور سے کریں گے۔

اپریل 1961ء کے آغاز پر ان کے بہنوئی خادم حسین اپنی بیوی اور بیٹی کو لے کر بمبئی پہنچے۔ اسپتال میں انہوں نے خان صاحب سے ملاقات کی۔ منور بھی وہیں

Marfat.com

موجود تھے۔ یہ ملاقات خاصے افسردہ ماحول میں ہوئی۔ رسمی باتوں کے اختتام پر خان صاحب نے منور کا ہاتھ عظمت کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا ''بیٹی! میں اسے تمہارے سپرد کر رہا ہوں۔ اب اس کا خیال رکھنا تمہارا فرض ہے۔''

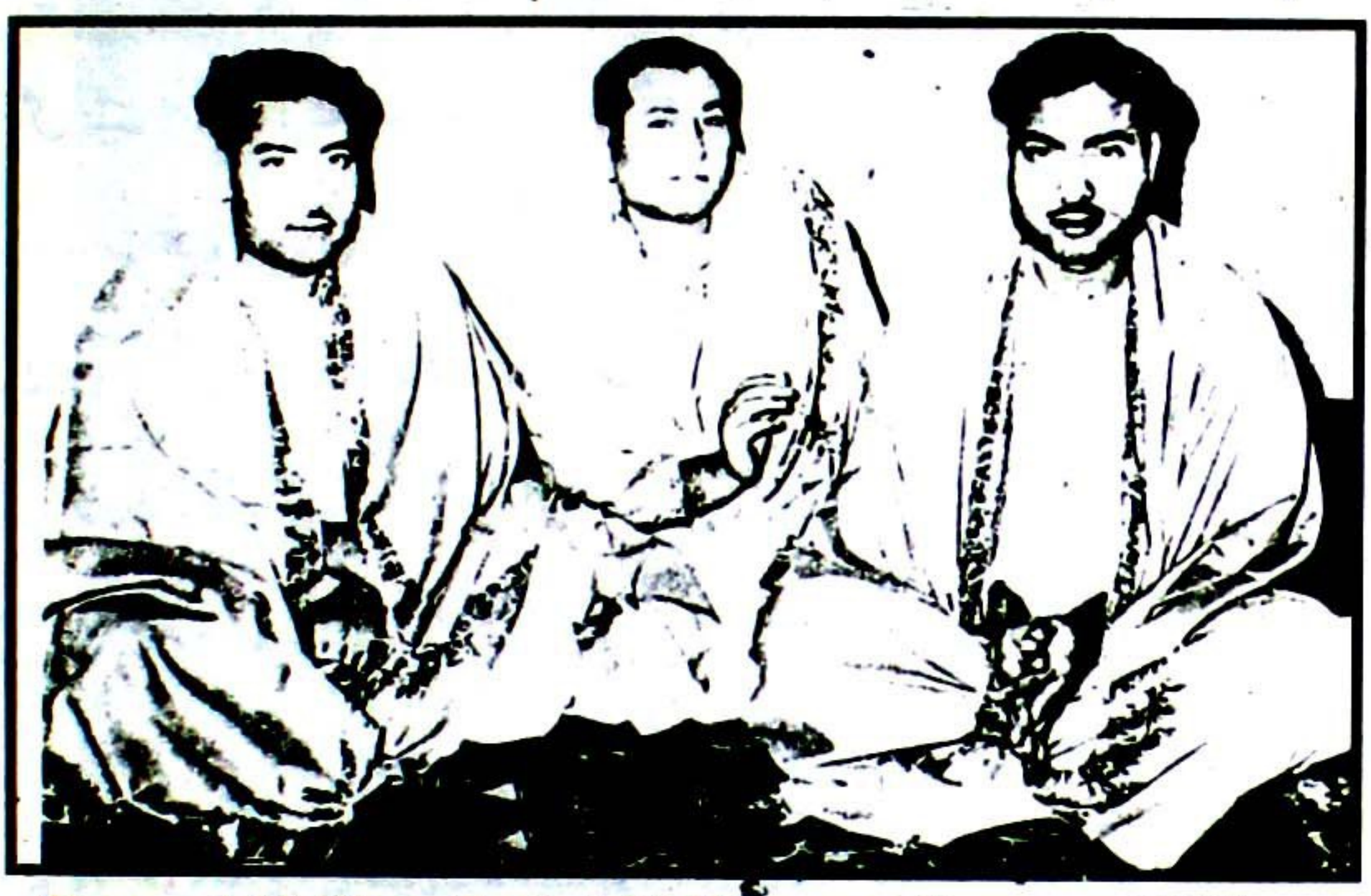

Karamat Ali Khan, Barkat Ali Khan and Munawar Ali Khan

منور اور عظمت کا نکاح تو 1959ء میں کراچی میں ہو چکا تھا لیکن رخصتی عمل میں نہیں آئی تھی۔ متذکرہ بالا ملاقات کے دو ہفتے بعد خان صاحب کو ہسپتال سے گھر جانے کی اجازت مل گئی۔ ان کی صحت بتدریج بہتر ہو رہی تھی۔ 26 اپریل 1961ء کو علامتی طور پر گویا دلہن عظمت کی رخصتی کی رسم ادا کر دی گئی اور وہ خان صاحب کی باقاعدہ بہو بن کر ''ہمت نواس'' میں آ گئی۔ اس موقعے پر روایتی انداز میں شادی کی خوشیاں منائی گئیں۔

خان صاحب بائیں طرف کے فالج کے باوجود اسپتال ہی میں دوبارہ گانا شروع کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ کئی برس بعد جب معذوری ہی کی حالت میں ایک نیم سرکاری ثقافتی ادارے نے خان صاحب پر ایک خاصی طویل دستاویزی فلم تیار

Marfat.com

کی تو اس میں عظیم موسیقار نوشاد نے یہ واقعہ اس طرح بیان کیا:

Khan Sahib with friends - L to R 2nd Munawar Ali Khan, Bade Ghulam Ali, 5th Barkat Ali Khan

''خان صاحب ہسپتال میں بیڈ پر دراز تھے۔ ان کا صرف دایاں ہاتھ اور پاؤں حرکت کر رہا تھا۔ وہ کئی بار گانے کی کوشش کر چکے تھے لیکن ناکام رہے تھے۔ اس روز انہوں نے اشارے سے فرمائش کی کہ ان کا سُرمنڈل ان کے سینے پر رکھ دیا جائے۔ سُرمنڈل ان کے سینے پر رکھ دیا گیا تو اس کے تار چھیڑتے ہوئے انہوں نے گانے کے لئے زور لگانا شروع کر دیا۔ حالانکہ ڈاکٹر صاحب انہیں ایسا کرنے سے منع کر چکے تھے۔انہوں نے کئی بار کوشش کی اور جب ان کے حلق سے آواز نہیں نکل سکی تو بے بسی سے ان کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تاہم انہوں نے کوشش ترک نہیں کی۔ ان کی انگلیاں سُرمنڈل پر حرکت کرتی رہیں ..... آنکھوں سے آنسو بہتے رہے ..... اوروہ قوت ارادی سے نہ جانے کس حد تک کام لیتے ہوئے گانے کے لئے شاید اپنی روح تک کا زور لگاتے رہے ..... اور پھر اس روز قدرت کا ایک عجیب کرشمہ دیکھنے میں آیا..... آخر کار ان کے گلے سے آواز یوں برآمد ہوئی جیسے پتھر کا جگر

Marfat.com

چیر کے جھرنا پھوٹتا ہے۔ دھیرے دھیرے انہوں نے گانا شروع کر دیا۔ ڈاکٹرز بھی انہیں گاتے سن کر حیران رہ گئے اور آخر کار انہوں نے بھی انہیں گاتے رہنے کی اجازت دے دی۔ان کا کہنا تھا کہ شاید یہی ان کا علاج ہے۔"

خان صاحب کا کہنا ہے کہ یہ ان کی زندگی کا مشکل ترین ریاض تھا۔ "ہمت نواس" میں ایک بار پھر ان کے ریاض کی آواز گونجنے لگی۔ سننے والوں کا کہنا تھا کہ پہلے اگر ان کی آواز میں جھرنوں کا سا ترنم تھا تو اب اس آواز میں سمندر کی سی وسعت اور گہرائی بھی آ گئی تھی۔ ان کی آواز ہمہ جہت تھی۔ وہ اپنے سننے والوں کو کسی بھی کیفیت میں لے جا سکتے تھے۔

1962ء میں انہیں ہندوستان کا موسیقی کا سب سے بڑا ایوارڈ "پدم بھوشن" دیا گیا اور ان کے اعزاز میں دہلی میں ایک بہت بڑی محفل موسیقی منعقد کی گئی۔ اس اعزاز کی بعد خان صاحب کے مزاج میں اور بھی زیادہ عاجزی آ گئی وہ ہر وقت اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے اور کہا کرتے کہ اِس نے مجھے نئی زندگی دی ہے ..... اور اس نئی زندگی میں پہلے سے بھی زیادہ خوشیوں اور پہلے سے بھی زیادہ اعزازات سے نوازا ہے۔

.....☆.....

Marfat.com

داتا غریب نواز کے مزار پر حاضری

خان صاحب ویسے تو کئی بار خواجہ معین الدین چشتیؒ المعروف خواجہ غریب نواز اور داتا غریب نواز کے مزار پر حاضری دے چکے تھے لیکن صحت یابی کے بعد وہ خاص طور پر مزار پر حاضری دینے کے لئے اجمیر شریف پہنچے۔ منتیں ماننے ..... اور منتیں پوری ہونے کے بعد اظہار تشکر کے طور پر دنیا بھر سے لوگ خواجہ صاحب کی درگاہ پر حاضر ہوتے ہیں۔ ان کا ایک لقب ''سلطان الہند'' بھی ہے۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ ان کی درگاہ پر ہر فرقے' ہر عقیدے' ہر مسلک ..... حتیٰ کہ ہر مذہب کے لوگ حاضری دیتے ہیں۔ ہندو' سکھ' عیسائی اور غیر ملکی بھی ان کے مزار پر حاضری دینے آتے ہیں۔ شہنشاہ اکبر نے آگرہ سے اجمیر تک ننگے پاؤں پیدل سفر کر کے ان کے مزار پر حاضری دے کر اپنی مراد پوری ہونے ..... یعنی سلطنت کا وارث پیدا ہونے پر عقیدت اور تشکر کا اظہار کیا تھا۔ اس طرح بزرگان دین کی درگاہوں اور مزاروں پر حاضری دینے والوں کا عقیدہ ہوتا ہے کہ وہ چونکہ اللہ کے ایسے نیک اور پسندیدہ بندے تھے کہ انہیں وسیلہ بنا کر' ان کے توسط سے اللہ سے دعا کی جائے تو اللہ تعالیٰ ضرور قبول فرماتے ہیں۔ ایک اندازہ یہ ہے کہ حج کے اجتماع کے بعد زائرین کا سب سے بڑا اجتماع اجمیر شریف میں خواجہ غریب نواز کی درگاہ پر ہوتا ہے۔ شہنشاہ اکبر نے یہاں

Marfat.com

تقریباً ایک کمرے کے سائز کی دو دیگیں نصب کرائی تھیں جن میں آج بھی مسلسل حلوہ تیار ہوتا رہتا ہے اور تبرک کے طور پر زائرین میں تقسیم ہوتا رہتا ہے۔

Ustad Bade Ghulam Ali Khan Sahib receiving the Padma Bhushan award from President Radhakrishnan in Delhi, 1962

صوفی اِزم ..... خصوصاً چشتیہ سلسلے میں موسیقی کی بھی ایک اہمیت ہے چنانچہ یہاں بڑے بڑے نامور قوال بھی اپنے فن کا مظاہرہ کرنے آتے ہیں۔ شیعہ ہونے کی ناتے استاد بڑے غلام علی خان صاحب امام بارگاہوں پر بھی حاضری دیتے تھے اور محرم کے دس دنوں میں گانے بجانے سے مکمل کنارہ کشی اختیار کر کے صرف مرثیے اور نوحے پڑھتے تھے۔ مرثیے اور نوحے کسی ساز کی سنگت کے بغیر عموماً راگ بیہاگ، مالکونس، درباری، بھوپالی اور توڑی میں پڑھے جاتے ہیں اور اساتذہ نے اس فن کو بلاشبہ کہیں سے کہیں پہنچا دیا ہے۔ لکھنؤ خاص طور پر نوحہ خوانی، مرثیہ خوانی اور سوز خوانی کا بے مثال مرکز تھا۔ حیدر آباد، دہلی اور پٹنہ نے بھی نوحہ خوانی کو کلاسیکی رنگ دیا۔ خواجہ غریب نوازؒ کے دربار پر اہل تشیع بھی بلا جھجک اور جوق در جوق حاضری دیتے

Marfat.com

ہیں۔ ان کے مزار پر ایک تختی پر جلی الفاظ میں کندہ ہے:

شاہ است حسینؑ شہنشاہ است حسین
دین است حسینؑ دین پناہ است حسین
سر داد نہ داد دست در دستِ یزید
حقا کہ بنائے لا الہ است حسین

خان صاحب اس بار حضرت خواجہ غریب نوازؒ کے مزار پر گئے تو انہیں گویا روحانی سے انداز میں ایک نئی بندش تیار کرنے کے لئے تحریک ملی۔ اس کا عنوان انہوں نے ''خواجہ غریب نواز'' رکھا اور وہیں گایا:

''میں ہو جاؤں تورے بائی ہار
جو چلے آویں سو پھل پاویں
سب رنگ ..... میں آؤں تورے دربار''

.....☆.....

Marfat.com

کلکتہ میں قیام

استاد بڑے غلام علی خان صاحب اور ان کی فیملی 1939ء میں کلکتہ پہنچی۔ انہوں نے تھیٹر روڈ پر واقع ''ہتوا ہاؤس'' میں قیام کیا۔ یہ مکان راجہ صاحب آف ہتوا کی ملکیت میں تھا۔ اس میں خان صاحب اور ان کی فیملی نے کچھ عرصہ راجہ صاحب کے مہمانوں کی حیثیت سے قیام کیا۔

اسی دوران میں ہندوستان کی نیم سرکاری ثقافتی ادارے ''سنگیت ناٹک اکیڈمی'' کی طرف سے ایک ٹیم خان صاحب کی زندگی اور فن کے بارے میں ایک دستاویز فلم بنانے کے لئے کلکتہ بھیجی گئی۔ یہ امر افسوس ناک ہے کہ جب خان صاحب فن اور جسمانی صحت دونوں ہی کے اعتبار سے عروج پر تھے' اس وقت ان کے بارے میں دستاویزی فلم بنانے کا خیال کسی بھی سرکاری یا غیر سرکاری ادارے کو نہیں آیا۔ اب جبکہ وہ فالج زدہ بھی تھے اور دل شکستہ تھی .....تو انہیں مختلف زاویوں سے کیمرے کا سامنا کرنا تھا۔ بہرحال وہ اس کام کے لئے تیار ہو گئے اور انہوں نے کسی زخمی شیر کی طرح اپنے مخصوص تخت پر بیٹھ کر کیمرے اور روشنیوں کا سامنا کیا۔ اس دوران میں انہیں یقیناً اپنی بے بسی اور لاچاری کا احساس ضرور ہوا ہو گا کیونکہ کبھی وہ پہلوانوں کی طرح مضبوط اور طاقتور تھے مگر اب وہ اپنی مرضی کے مطابق اپنے ہاتھ پیروں کو حرکت

Marfat.com

بھی نہیں دے سکتے تھے۔ کبھی وہ اسٹیج پر آتے تھے تو ان کے فنی قد کاٹھ کے ساتھ ساتھ ان کا جسمانی قد کاٹھ' عمدہ صحت اور بارعب شخصیت حاضرین کو سحرزدہ کر دیتی تھی اور اب یہ عالم تھا کہ ان کے ہاتھ سے کوئی چیز گر جاتی تھی تو وہ اسے اٹھانے کے لئے جھک بھی نہیں سکتے تھے۔

Khan Sahib sitting on the takht

انہوں نے بعد میں اس موضوع پر بات کرتے ہوئے ایک بار مجھے بتایا

''کوئی اندازہ نہیں کر سکتا کہ میں اس وقت خود کو کتنا شرمندہ اور قابلِ رحم محسوس کرتا ہوں جب لوگ مجھے سہارا لے کر اٹھاتے بٹھاتے ہیں اور چھوٹے چھوٹے کاموں کے لئے میں اپنے آپ کو ان کا محتاج محسوس کرتا ہوں۔''

Marfat.com

A new beginning in Calcutta
Ustad Bade Ghulam Ali Khan

تاہم ان کی خوش قسمتی یہ تھی کہ وہ اب بھی اپنا محبوب سُرمنڈل گود میں رکھ کر دائیں ہاتھ کی انگلیوں سے موسیقی بکھیر سکتے تھے اور جو راگ چاہتے' وہ الاپ سکتے تھے۔ متذکرہ بالا دستاویزی فلم کا آغاز ہی اس طرح ہوتا ہے کہ انہیں اپنے مخصوص چوبی تخت پر بیٹھے اپنے سُرمنڈل کے تار درست کرتے دکھایا گیا ہے۔ پھر وہ گویا دل کی گہرائیوں سے ایک بوجھل سانس لے کر راگ بھیروی چھیڑتے ہیں۔ راگ بھیروی سورج کی پہلی کرن اور دن کے آغاز کی علامت ہے۔ یہ فلم کئی دن میں مکمل ہوئی اور خان صاحب نے اپنی تمام تر دشواریوں اور بے آرامی کے باوجود فلم کے پروڈیوسرز اور

Marfat.com

ڈائرکٹرز سے بھرپور تعاون کیا۔ سنگیت ناٹک اکیڈمی کے ذخیرے میں یہ فلم آج بھی خان صاحب کی بہت سی محافلِ موسیقی کی دیگر ریکارڈنگز کے ساتھ محفوظ ہے۔ ان ریکارڈنگر کے ٹکڑے اس فلم میں بھی جوڑے گئے ہیں اور موسیقی کے دیگر اساتذہ اور ناقدین کے' خان صاحب کے بارے میں انٹرویوز بھی شامل کیے گئے ہیں۔ اسی فلم میں ایک بڑے گائیک استاد سلطان خان نے اپنے انٹرویو میں بتایا ہے کہ استاد بڑے غلام علی خان ایک بار ایک محفل میں گا رہے تھے:

کوئلیا مت کر پکار.....

تو قریبی باغ سے ایک کوئل اڑتی ہوئی پنڈال میں آئی اور سیدھی جا کر خان صاحب کے سامنے مائیک پر بیٹھ گئی۔ جب تک خان صاحب گاتے رہے' کوئل گویا محویت اور انہماک کے عالم میں ان کے سامنے مائیک پر ساکت بیٹھی انہیں دیکھتی رہی اور جب انہوں نے گانا ختم کیا تو اڑ گئی۔ یہ ایک حیرت انگیز منظر تھا جس نے حاضرین کو مبہوت کر دیا۔

Bade Ghulam Ali Khan's shagird Meera

کلکتہ موسیقی کے مداحوں کا گڑھ تھا۔ جلد ہی خان صاحب کو موسیقی کے بہت بڑے بڑے قدر دانوں کی محفلوں میں گانے کے لئے مدعو کیا جانے لگا۔ خان صاحب

Marfat.com

نے بعد میں اپنے بمبئی اور کلکتہ کے قیام میں فرق واضح کرتے ہوئے مجھے بتایا کہ مہاراشٹر کے لوگ شاستریہ سنگیت کے زبردست نقاد اور تجزیہ کار ہیں اور فن کے بارے میں ان کا زاویہء نظر تیکنیکی ہوتا ہے جبکہ کلکتہ کے لوگ صرف فن پرست ہیں اور موسیقی سے ان کا تعلق جذباتی ہے۔ بنگال کے لوگ اچھی موسیقی کو والہانہ انداز میں سنتے ہیں اور اس میں کھو جاتے ہیں۔ یہ محویت اور انہماک دوسرے علاقے کے لوگوں میں مشکل سے دیکھنے کو ملتا ہے۔ موسیقی سے یہ وابستگی انہیں قدیم صوفیوں سے ورثے میں ملی ہے۔ بنگال کی موسیقی کی تاریخ میں بہت سے صوفی' سنت اور سادھو ''معرفتی گان'' یا ''صوفیانہ کلام'' اور موسیقی کی سنگت کے ضمن میں بڑا نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ ٹیگور نے اپنے مشہور عالم ''رابندر سنگیت'' کی بنیاد بھی درحقیقت بنگال کے اسی تاریخی پس منظر سے متاثر ہو کر رکھی تھی۔ گوکہ اس میں مغربی موسیقی کی آمیزش بھی محسوس ہوتی ہے لیکن اس کی بنیاد بنگالی ہی ہے۔ کلکتہ میں ایسی بہت سی ممتاز شخصیات موجود تھیں جنہوں نے خان صاحب کے آرام و آسائش کا خیال رکھنے اور حقیقی معنوں میں انہیں اپنائیت بھرے گھر کا سا ماحول فراہم کرنے کی پوری پوری کوشش کی۔ ان شخصیات میں ایک تو آر۔سی۔ بورالی تھے جو اس زمانے کی فلمی دنیا کے ایک ممتاز میوزک ڈائرکٹر تھے۔ دیگر لوگوں میں لالہ بابو' پنڈت پراشر' شری ادھیراج مکرجی' شری یو۔ ایس۔ لال کے علاوہ خان صاحب کے قریبی دوست شنکر بابو' پٹیل بابو اور بگچی داد شامل تھے۔ یہ لوگ خان صاحب سے والہانہ محبت کرتے تھے اور انہوں نے خان صاحب کو ہاتھوں ہاتھ لیا تھا۔

Marfat.com

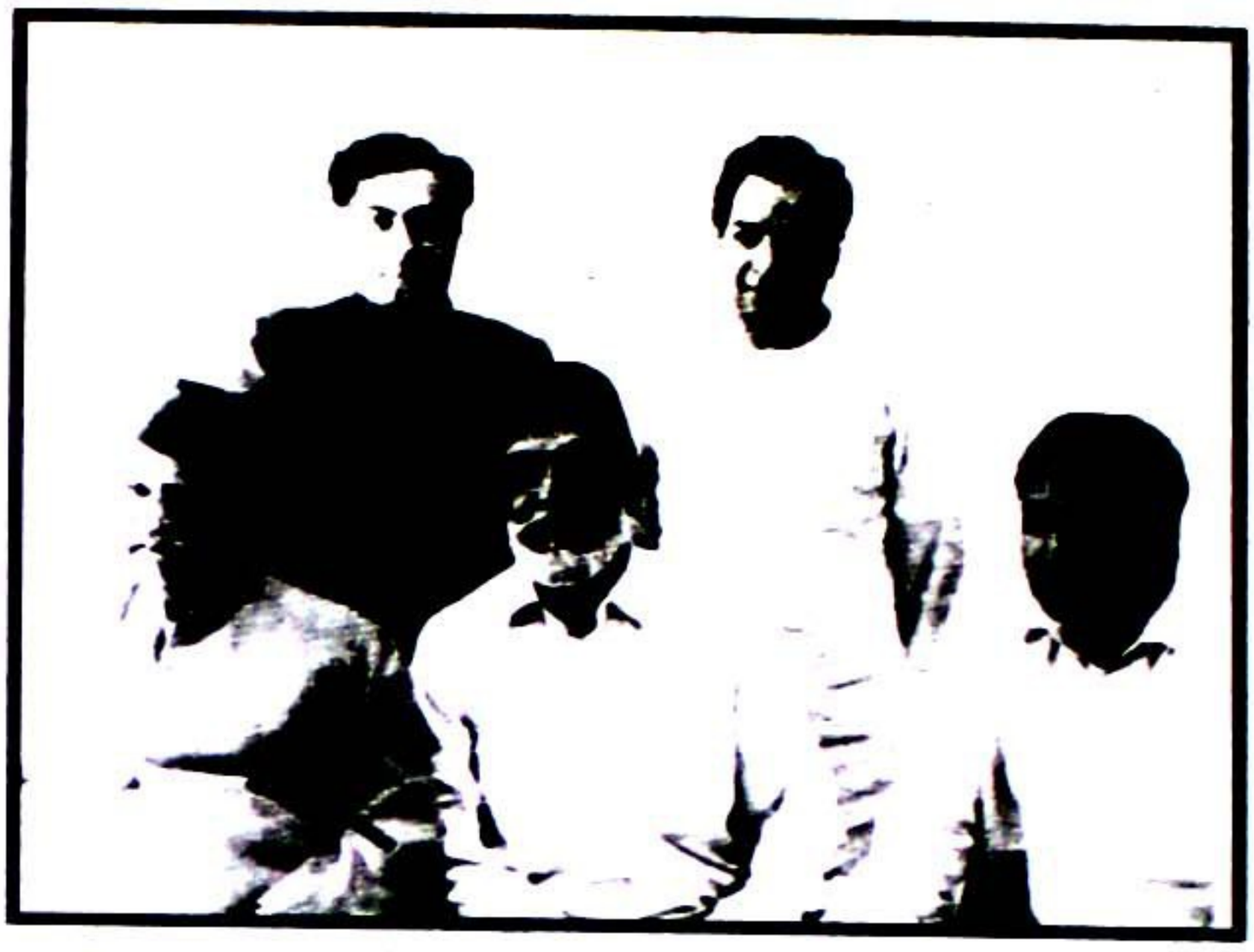

Standing- Munawar Ali Khan, Ustad Vilayat Khan
Sitting- Bade Ghulam Ali Khan Sahib,
his friend Yusuf Mian and Amir Ali his nephew

گائیک برادری نے بھی خان صاحب کو کلکتہ میں گرمجوشی سے خوش آمدید کہا۔ ان میں نمایاں نام استاد ولایت خان' شری رادھیکا موہن موئترا' استاد علی اکبر خان' طبلہ نواز استاد کرامت خان' استاد شوکت علی خان' استاد رحیم الدین وغیرہ کے تھے۔ اس درجے کے اساتذہ خود استاد بڑے غلام علی خان صاحب کے مداح تھے۔ گویا یہ کہنا بے جا نہیں کہ خان صاحب استادوں کے استاد تھے۔ اس کا اندازہ استاد دلشاد خان کی ایک بات سے بھی ہوتا ہے۔ ''سنگیت ناٹک اکیڈمی'' کی جس دستاویزی فلم کا تذکرہ اوپر آیا ہے' اس میں خان صاحب کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے استاد دلشاد خان نے کہا ہے ''میری تو پرورش ہی ان کے گانوں سے ہوئی ہے۔ وہ موسیقی اور گائیکی پر اتنا عبور رکھتے تھے کہ گانے کے دوران میں اگر ایک سُر چھوڑ بھی جاتے تب بھی راگ میں کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ یہ کمال استاد بڑے غلام علی خان صاحب کے سوا کسی کو حاصل نہیں تھا۔''

Marfat.com

Ustad Bade Ghulam Ali and Munawar in concert

خان صاحب کو کلکتہ اتنا پسند آیا کہ انہوں نے مستقل سکونت اختیار کرنے کا فیصلہ کیا۔ انہیں پاک سرکس کے علاقے میں "بیگ باگن" نام کی ایک عمارت میں فلیٹ مل گیا۔ یہ مسلم اکثریت کا علاقہ تھا جس میں بہت سی مسجدیں بھی تھیں۔ بازار بھی قریب ہی تھا۔ نامور ستار نواز عنایت خان مرحوم بھی ان دنوں اسی علاقہ میں رہتے تھے۔ ان کے صاحبزادگان استاد ولایت خان اور استاد امرت خان ستار کے غیر معمولی ماہر سمجھے جاتے تھے۔ ان کے شاگردوں کا ایک وسیع حلقہ تھا جن میں سے بعض استاد بڑے غلام علی خان صاحب سے بھی اکتسابِ فن کر چکے تھے۔ ان سب نے خان صاحب کو گرمجوشی سے خوش آمدید کہا۔

اس زمانے میں میں (مالتی جیلانی) اور میری بہن اندرا دیال کلکتہ ہی میں رہ رہی تھیں۔ میری بہن استاد امرت خان سے ستار بجانا سیکھ رہی تھی۔ ایک روز میں بھی اس کے ساتھ استاد امرت خان صاحب کے گھر چلی گئی اور میں نے ان سے فرمائش کی

Marfat.com

کہ وہ مجھے استاد بڑے غلام علی خان صاحب سے ملوا دیں' میں ان کی شاگرد بننا چاہتی ہوں۔ استاد امرت خان صاحب بولے ''میں تمہیں ابھی لے چلتا ہوں۔''

Padmaja Naidu - Governor of Bengal conferring a Doctorate on Bade Ghulam Ali Khan in Calcutta

چنانچہ ہم دونوں خان صاحب کے گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔ میں اس تصور سے کچھ ہیجان زدہ اور گھبرائی ہوئی تھی کہ سازو آواز کی دنیا کے اتنے بڑے آدمی سے ملاقات کے لئے جا رہی تھی۔ ان کی تین منزلہ بلڈنگ کے مین گیٹ سے ایک تنگ

Marfat.com

ڈرائیوے اندر جا رہا تھا۔ خان صاحب گراؤنڈ فلور پر رہتے تھے۔ ہم بڑے کمرے میں داخل ہوئے تو خان صاحب سامنے ہی لکڑی کے تخت پر آلتی پالتی مارے، بیٹھے نظر آ گئے۔ وہ ایک سفید چادر اوڑھے ہوئے تھے۔ کمرے میں فرنیچر نام کی واحد چیز وہ تخت ہی تھا۔ فرش پر قالین تھا اور خان صاحب تخت پر دو گاؤ تکیوں کے سہارے بیٹھے تھے۔ ان کے سامنے گنبد کی شکل کا ایک نقرئی پاندان رکھا تھا۔ فرش کے قالین پر چاندنی بھی بچھی ہوئی تھی۔

انہوں نے سر اٹھا کر ہماری طرف دیکھا۔ ان کی بڑی بڑی، گھنی اور بارعب مونچھوں کے نیچے، ان کے ہونٹوں پر بچوں جیسی معصوم اور پرمسرت مسکراہٹ تھی۔ ایک سچے اور درویش صفت فنکار میں آپ کو یہ خوبی بھی نظر آئے گی کہ وہ اکثر آپ کو خوش باش اور اپنے حال میں مگن ملے گا۔ خان صاحب ویسے بھی ملاقاتیوں کو دیکھ کر بہت خوش ہوتے تھے اور جلد ہی ان میں گھل مل جاتے تھے۔ انہوں نے اشارے سے ہمیں فوراً ہی اندر بلالیا اور بیٹھنے کے لئے کہا۔

امرت خان صاحب نے استاد بڑے غلام علی خان صاحب کو بتایا ''ستیاناتھ صاحب کے فلیٹ پر محفل موسیقی میں آپ کی ملاقات اس خاتون سے ہو چکی ہے۔ یہ آپ سے گانا سیکھنا چاہتی ہیں۔''

خان صاحب مسکرائے اور بولے ''میں تو صرف اپنے شاگردوں کو سکھاتا ہوں۔''

امرت خان صاحب بولے ''تو پھر انہیں بھی اپنی شاگرد بنا لیجئے۔''

خان صاحب چند لمحوں کے لئے سوچ میں پڑ گئے پھر بولے ''معلوم نہیں میں

Marfat.com

زیادہ عرصہ کلکتہ میں رہوں یا نہیں ....."

In Calcutta: L to R 2nd Ustad Barkat Ali Khan, Pandit Prashar, 5th Ustad Bade Ghulam Ali Khan and a postman friend of Khan Sahib Nishi Kant Babu

اس موقع پر میں نے اپنی تمام جرأت مجتمع کر کے کہا ''خان صاحب! ایک عرصے سے میری خواہش تھی کہ آپ کی باقاعدہ شاگرد بنوں اور آپ سے گانا سیکھوں۔ یہ میرے لئے بہت بڑا اعزاز ہوگا' اگر میں آپ کے قدموں میں بیٹھ کر آپ سے کچھ سیکھ سکوں۔'' تب وہ مسکرائے اور سادہ سی پنجابی میں مجھ سے مخاطب ہوئے۔ وہ پوچھ رہے تھے ''کیا تمہیں تھوڑا بہت گانا آتا ہے؟''

میں نے ہچکچاتے ہوئے جواب دیا ''جی ہاں ..... خان صاحب! میں نے تھوڑا بہت سیکھا ہے۔''

''ٹھیک ہے .....تو پھر کچھ سناؤ۔'' انہوں نے کہا۔

میں نے سنگیت ودیالہ کے سادہ انداز میں راگ دیش سنانا شروع کیا۔ خان صاحب نے گویا قدرے محظوظ ہوتے ہوئے اپنے بیٹے منور کو پکارا۔ انہیں وہ ''مینو'' کہہ کر پکارتے تھے۔ وہ بولے ''مینو! یہاں آؤ ..... اور ذرا یہ ودیالہ تعلیم کی گائیکی

Marfat.com

سنو ....."

موسیقی کے وہ سکول جنہیں سنگیت وِدیالہ کہا جاتا تھا' نہایت ابتدائی' سادہ اور ناپختہ سی گائیکی کی تعلیم دیتے تھے۔ خان صاحب جیسے استاد کی نظر میں وہ نہایت معمولی چیز تھی تاہم وہ مشفقانہ انداز میں مسکرائے اور بولے "بیٹر! گانا سیکھنا ایک بہت ہی مشکل کام ہے اور ہر ایک کے بس کی بات نہیں ..... کیا تم پوری یکسوئی کے ساتھ اپنی زندگی اس فن کے لئے وقف کر دینے کو تیار ہو؟"

میں نے جواب دیا "خان صاحب! اگر آپ مجھے اپنی شاگرد بنا لیتے ہیں تو میں اپنی سی پوری کوشش کروں گی کہ حصولِ فن کے تقاضے پورے کر سکوں۔"

اس دوران میں چائے آ چکی تھی۔ خان صاحب نے خود مجھے چائے کا کپ دیا۔ میرے لئے یہ بہت بڑا اعزاز تھا کہ میں ایک عظیم گائیک کے ہاتھ سے چائے پی رہی تھی۔ گائیکی کے سلسلے میں اپنے دل میں ان گنت امیدیں اور آرزوئیں رکھنے والی ایک نوجوان اور نو آموز عورت سے وہ جس شفقت اور مہربانی سے پیش آ رہے تھے اس سے میری خوشی کی انتہا نہیں رہی تھی۔ میرے ایک بہت ہی بڑے خواب کو گویا تعبیر مل گئی تھی۔

ہماری یہ ملاقات اور بات چیت نومبر 1963ء میں ہوئی تھی۔ اس کے بعد کلکتہ میں اچانک ہندو مسلم فساد پھوٹ پڑے۔ فساد کسی بہت ہی معمولی بات پر شروع ہوا تھا اور وہ یقیناً اسی قسم کے تنازعات پر سیاست چمکانے والے لوگوں کی سرگرمیوں کا شاخسانہ تھا۔ انڈیا نہایت عجیب و غریب اور متضاد مزاجوں کا ایسا معاشرتی ملغوبہ ہے جس کی اس معاملے میں کسی اور ملک سے مماثلت نہیں ہے۔ ایک طرف تو اس کے

Marfat.com

معاشرتی رنگوں میں آپ کو بے پناہ شائستگی' انسانیت' بھائی چارہ' تہذیب' مروّت اور رحم دلی نظر آئے گی۔ دوسری طرف جب تصادم کی فضا پیدا ہو گی تو وحشت' بربریت اور درندگی کے وہ مظاہر دیکھنے کو ملیں گے کہ شیطان بھی شرما جائے۔ خان صاحب کا فلیٹ مسلم اکثریت کے علاقے میں تھا اور ہم بالی گنج' سرکلر روڈ پر ایک عمارت میں رہتے تھے جو ٹیو ولی کورٹ کہلاتی تھی۔ فسادات کی وجہ سے میرا خان صاحب کے گھر جانا ہی ممکن نہ رہا اور ہمیں امن امان بحال ہونے کا انتظار کرنا پڑا۔

جب حالات معتدل ہوئے تو ہم ایک مرتبہ پھر خان صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اس بار میری والدہ بھی میرے ساتھ تھیں جو مجھ سے ملنے کلکتہ آئی ہوئی تھیں۔ خان صاحب ان سے بھی مل کر بہت خوش ہوئے اور انہوں نے اپنی اہلیہ' بیگم اللہ رکھی کو بھی آواز دے کر بلا لیا۔ وہ بھی بہت محبت اور شفقت سے ہم سے ملیں۔ وہ تقریباً پچاس کی عمر کی' چھوٹے قد کی فربہ اندام اور نہایت ہنس مکھ' خلیق اور ملنسار خاتون تھیں۔ ان کے ہونٹوں پر ہر وقت ایک من موہنی سی مسکراہٹ رقصاں رہتی تھی اور گہری سیاہ آنکھوں میں ایک ایسی عجیب سی چمک تھی جو ہر ایک کو اپنائیت کا احساس دلاتی تھی۔

انہیں ہر کوئی اماں کہہ کر بلاتا تھا۔ انہوں نے اپنی زندگی گویا خان صاحب کے لئے وقف کر دی تھی۔ وہ دل و جان سے ان کی خدمت میں لگی رہتی تھیں۔ ایک معذور انسان کو سنبھالنا اور اس کی خدمت کرنا کوئی آسان کام نہیں ہوتا لیکن وہ نہایت خندہ پیشانی اور محبت سے ان کا ہر کام کرتیں۔ انہیں نہلانا' دھلانا' کپڑے پہنانا اور ان کی ہر ضرورت کا خیال رکھنا ان کا کام تھا اور وہ بڑے مسرور اور آسودہ لہجے میں اکثر کہا کرتی ''یہ میری خوش قسمتی ہے کہ میں اپنے خان صاحب کی خدمت کے لئے موجود

Marfat.com

ہوں۔"

خان صاحب کا فلیٹ صرف تین کمروں پر مشتمل۔ سامنے کے کمرے میں خان صاحب کا بیشتر وقت گزرتا تھا جہاں وہ لوگوں سے ملاقات کرتے اور شاگردوں کو تربیت دیتے۔ دوسرے کمرے میں ان کی بیگم رہتی تھیں جبکہ تیسرے کمرے میں منور اپنی بیوی اور بچی کے ساتھ رہتے تھے۔ خان صاحب کھانا وغیرہ بھی اپنے تخت پر ہی کھاتے تھے جس میں اکثر ملاقاتی اور مہمان بھی شریک ہو جاتے تھے۔

لماں اس پہلی ملاقات کے موقع پر تھوڑی دیر بعد اندر چلی گئیں۔ جلد ہی ایک ملازمہ ہمارے لئے چائے لے آئی۔ چائے کے دوران مجھے باقاعدہ طور پر شاگرد بنانے کے لئے رسوم کی ادائیگی کی تاریخ مقرر کر دی گئی۔ روایت کے مطابق اس روز میری طرف سے خان صاحب اور بیگم کے لئے کپڑوں کا ایک جوڑا اور کچھ رقم ایک طشتری میں رکھ کر پیش کی گئی۔ اسے "نذرانہ" کہا جاتا تھا۔ دوسری ٹرے میں مٹھائی "بتاشے" شکر چڑھے چنے' اس طرح کی دوسری دو چار چیزیں اور رنگ برنگے دھاگوں کو لپیٹ کر بنایا گیا' پتلی رسی سے مشابہ ایک ٹکڑا موجود تھا جسے "گنڈا" کہا جاتا تھا۔ استاد یہ گنڈا اپنے ہونے والے شاگرد کی کلائی پر باندھتا ہے اور اپنے ہاتھ سے اسے چنے اور گڑ کھلاتا ہے اور یوں وہ باقاعدہ "گنڈا بند" شاگرد قرار پاتا ہے۔ اس کے بعد شربت یا چائے سے مہمانوں کی تواضع کی جاتی ہے۔ ان رسوم کی ادائیگی کے فوراً بعد ہی موسیقی کی تعلیم کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔

میرے شاگرد بننے یا "گنڈا بندی" کی رسم 10 دسمبر 1963ء کو انجام پائی اس کے بعد میں نے روزانہ صبح کو گائیکی کی تربیت حاصل کرنے کے لئے جانا شروع کر دیا۔

Marfat.com

ہمارے گھروں کی درمیان فاصلہ زیادہ نہیں تھا۔ میں کبھی پیدل اور کبھی گاڑی لے کر چلی جاتی۔ میری بلا ناغہ آمد' لگن اور شوق کو دیکھ کر خان صاحب بھی حیران اور خوش ہوتے۔ وہ اکثر بیگم اللہ رکھی سے کہتے ''اس لڑکی کو دیکھو ..... آندھی ہو یا طوفان ..... یہ ضرور سرسوتی دیوی کی خدمت میں حاضر ہو جاتی ہے۔''

صبح کی نشست میں کچھ دوسری لڑکیاں بھی تربیت کے لئے آتی تھیں جن میں میرا' سندھیا' منوتی' آہلی اور منوررما کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ انہی دنوں مشہور طبلہ نواز استاد نظام الدین خان صاحب کلکتہ آئے۔ انہیں ولایت خان صاحب نے اپنی موسیقی کی محفلوں میں طبلے پر سنگت کرنے کی غرض سے بلایا تھا۔ بڑے غلام علی خان صاحب بھی نوجوان طبلہ نواز نظام الدین خان کو بہت پسند کرتے تھے۔ انہوں نے نظام الدین سے فرمائش کی کہ وہ بمبئی واپس نہ جائیں بلکہ مستقل طور پر کلکتہ میں ہی ٹھہر جائیں۔ نظام الدین صاحب نے ان کی بات نہیں ٹالی۔ ان کا قیام خان صاحب کے کمرے میں ہی تھا اور وہ انہی کے تخت کے نیچے سو جاتے تھے۔ اس دور کے فنکاروں میں روپے پیسے اور آرام و آسائش کی طمع بالکل نہیں تھی۔ وہ کاروباری انداز میں سوچنا تو درکنار' دو وقت کی روٹی کی بھی فکر نہیں کرتے تھے اور یہی کہتے تھے کہ رزق روزی کا ذمہ تو اللہ تعالیٰ نے لے رکھا ہے' ان کا کام تو خلوص دل سے فن کی خدمت کرنا ہے۔

مجھے گائیکی کی تعلیم حاصل کرتے چند ہفتے گزر چکے تو میں نے اپنے دوست اور کلاس میٹ کوی سنگھ اور اس کی بیوی دیویکا سنگھ سے کہا کہ وہ اپنے گھر میں ایک محفل رکھیں اور خان صاحب کو گانے کے لیے مدعو کریں۔ وہ لوگ لِی روڈ پر کافی بڑے مکان میں رہتے تھے۔ خان صاحب نے ہماری دعوت قبول کر لی اور تاریخ طے ہو گئی تو ہم

Marfat.com

نے اپنے حلقہء احباب کے لوگوں کو دعوت دے ڈالی۔ اس کے علاوہ ہم نے آپس میں کچھ رقم جمع کر کے ایک تھیلی میں ڈالی اور وہ تھیلی خان صاحب کی خدمت میں پیش کی۔ اس زمانے میں فنکاروں کو مدعو کرنے کے آداب کچھ ایسے ہی تھے۔ دعوت قبول کرنا یا نہ کرنا ان کی پسند نا پسند پر منحصر ہوتا تھا۔ اس کے لیے وہ باقاعدہ کسی مخصوص رقم کا مطالبہ نہیں کرتے تھے۔ قدر دانوں سے جو بن پڑتا تھا' اکٹھا کر کے تھیلی میں ان کی خدمت میں پیش کر دیتے تھے جسے وہ ان کے سامنے کھول کر بھی نہیں دیکھتے تھے اور اکثر تو تکلفاً انکار ہی کرتے تھے۔ آج کل فنکاروں کا جو حال ہے' وہ آپ کو معلوم ہی ہو گا۔ زمانے کے ساتھ ساتھ قدریں کتنی بدل گئی ہیں۔

بیماری اور فالج کے حملے کے بعد جب سے خان صاحب دوبارہ گانے کے قابل ہوئے تھے تب سے عام طور پر وہ محفلوں میں پوجھل راگ گاتے تھے لیکن اس رات وہ کوی سنگھ کے ہاں گانے کے لئے آئے تو بہت اچھے اور شگفتہ موڈ میں تھے۔ انہوں نے راگ ایمن سے محفل کا آغاز کیا۔ بڑی تعداد میں سامعین موجود تھے جن میں بڑی کمپنیوں کے ایگزیکٹو آفیسر ٹائپ لوگ بھی تھے جنہیں کلاسیکی موسیقی کی زیادہ سمجھ بوجھ نہیں تھی لیکن اس روز خان صاحب نے ہلکے پھلکے اور شگفتہ راگوں سے انہیں بھی خوب محظوظ کیا۔

اس کنسرٹ کے بعد جلد ہی ..... یعنی جنوری 1964ء میں کلکتہ کی وشوا بھارتی یونیورسٹی نے ایک خصوصی کانو وکیشن میں خان صاحب کو ڈی۔ لِٹ' اعزازی ڈگری سے نوازا۔ یہ ڈگری بنگال کی گورنر پدمجا۔ ایس۔ نائیڈو نے ان کی خدمت میں پیش کی۔ ڈاکٹریٹ کی یہ اعزازی ڈگری ملنے کے موقعے پر اس عظیم الشان فنکشن میں بھی خان صاحب کو سنا گیا۔ انہوں نے راگ بھوپالی میں اپنی تیار کی ہوئی بندشیں

Marfat.com

سنائیں۔ منور علی خان صاحب نے بھی اس موقعے پر اپنے فن کا مظاہرہ کیا باپ بیٹے نے گائیکی کا اختتام راگ ترانہ پر کیا۔ اعزازی ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کر کے خان صاحب بچوں کے سے معصومانہ انداز میں خوش نظر آرہے تھے۔ تقریب کے اختتام پر انہوں نے کہا ''جس طرح علامہ اقبال کو ان کی شاعری پر اعزازی ڈاکٹریٹ کی ڈگری ملی تھی' اسی طرح مجھے موسیقی پر اعزازی ڈگری ملی ہے۔

صبح کے وقت میں میرا موسیقی کی تعلیم کا سلسلہ جاری رہا۔ میں عام طور پر سب شاگردوں سے پہلے وہاں پہنچ جاتی تھی۔ خان صاحب بھی سکھانے کے معاملے میں بڑی باقاعدگی کا مظاہرہ کرتے تھے۔ وہ صبح جلدی اٹھتے تھے۔ نظام الدین صاحب کو وہی جگاتے تھے۔ وہ تخت کے نیچے سے نکل آتے تو میں کمرے کی جھاڑ پونچھ اور چیزوں کو درست کر دیتی۔ چاندنی جھاڑ کر دوبارہ قالین پر بچھا دیتی۔ خان صاحب تخت پر اور ہم قالین پر بیٹھتے۔ شروع شروع میں خان صاحب نے مجھے تان پورہ کی تاریں کسنا سکھایا۔ تان پورہ کی تاریں درست انداز میں کسنا یا ٹیون کرنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ یہ ایک بہت مشکل اور ریاضت طلب کام ہے۔ موسیقی کی تعلیم کے سلسلے کی یہ ابتدائی ..... مگر نہایت اہم کڑی ہے۔ آواز کے زیروبم پر قابو حاصل کرنے کا فن خیال گائیکی سیکھنے ہی میں جتنا مشکل ہے۔ خان صاحب کا کہنا تھا کہ اگر جوانی میں ہی تم لوگوں کی آواز کمزور رہی تو میری عمر میں کیا حال ہوگا؟

دوپہر کے کھانے کے بعد خان صاحب کچھ دیر قیلولہ کرتے چار بجے چائے پیتے اور میرے دوبارہ آنے کا انتظار کرتے۔ میں دوبارہ آتی تو انہیں اپنی فیٹ کار میں گھمانے لے جاتی۔ کھلی ہوا میں گھوم پھر کر اور شہر کا نظارہ کر کے وہ بے حد خوش

Marfat.com

ہوتے۔ میرے برابر کی سیٹ پر وہ اپنی گود میں ایک رومال میں بہت سے سکے لے کر بیٹھتے اور جس سگنل پر بھی کار رکتی' وہ وہاں فقیروں میں سکے بانٹتے۔ خان صاحب خاصے باتونی بھی تھے۔ وہ زندگی کے چھوٹے موٹے دلچسپ واقعات سنانا اور گپ شپ کرنا پسند کرتے تھے۔ کبھی کبھی لطیفے بھی سناتے تھے۔ لوگ ان کی صحبت میں بور نہیں ہوتے تھے۔ شہر کی سیر کے دوران وہ موسیقی اور راگوں کے بارے میں راز کی باتیں بھی بتاتے۔ وہ اپنے علم کے بارے میں بخیل نہیں تھے۔ ہر بات شاگردوں کو بتانے اور سمجھانے کی کوشش کرتے تھے۔ کچھ چھپاتے نہیں تھے۔ میں اپنے آپ کو خوش قسمت محسوس کرتی تھی کہ اپنی تمام تر نوجوانی اور ناتجربہ کاری کے باوجود مجھے ان کے دل کی گہرائی سے امنڈنے والے خیالات جاننے کے سب سے زیادہ مواقع ملتے تھے اور میں ان کے افکار سے زیادہ سے زیادہ فیض یاب ہوتی تھی۔ میں ان کا سایہ ایک باپ کی طرح اپنے سر پہ محسوس کرتی۔ مشرق میں استاد اور شاگرد کا رشتہ پرانی روایتوں کے مطابق کچھ ایسا ہی ہے۔ خان صاحب اپنے الفاظ میں علم کی تشریح اس طرح کرتے تھے ''علم کا مطلب ہے' عنایت الٰہی .....لطفِ استاد .....اور محنت شاگرد۔''

دیگر دنیاوی علوم کے سلسلے میں تو استاد اور شاگرد کا رشتہ بہت کمزور پڑ چکا ہے اور اس کی ہیئت بھی کافی حد تک تبدیل ہو چکی ہے لیکن موسیقی کی دنیا میں اب بھی اس رشتے کی روایتیں کافی حد تک برقرار ہیں۔ شاگردی کی رسوم بھی اسی طرح ادا کی جاتی ہیں۔ یہ خیال آج بھی راسخ ہے کہ صحیح استاد اور دیانتدارانہ ریاض کے بغیر آپ موسیقی کا علم حاصل نہیں کر سکتے۔

.....☆.....

Marfat.com

آشرم میں محفل موسیقی

استاد بڑے غلام علی خان صاحب کو کیسی کیسی جگہوں سے گانے کے لئے بلاوے آتے تھے' اس کا اندازہ اس واقعے سے لگایئے کہ ایک روز ایک مختصر الوجود سوامی (سادھو' فقیر' منش) ان سے ملنے آ پہنچا۔ وہ بارہ نگر کے ''راما کرشنا مشن'' سے آیا تھا۔ بارہ نگر' کلکتہ کے مضافات کی ایک بستی تھی اور ''راما کرشنا مشن'' وہاں کا ایک آشرم تھا جس کے روح رواں یا گرو نے چپ کا روزہ رکھا ہوا تھا مگر وہ خان صاحب کو سننے اور آشرم میں موجود سنیاسیوں اور ''سنیاسنوں'' کو سنوانے کا خواہش مند تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اگر خان صاحب آشرم میں مقیم سادھو سنت ٹائپ خواتین اور حضرات کے سامنے آ کر گائیں تو ان کی روح کو جلا مل سکتی ہے۔

خان صاحب نے یہ دعوت قبول کر لی اور مقررہ تاریخ پر وہی سوامی' خان صاحب کو لینے آ گیا۔ ایک گھنٹے کی ڈرائیو کے بعد ہم بارہ نگر کے اس آشرم میں پہنچے جہاں سنیاسی مردوں اور عورتوں نے انتہائی عقیدت اور گرم جوشی سے خان صاحب کا استقبال کیا۔ ہمیں اندر اس حصے میں لے جایا گیا جو ان لوگوں کے عقیدے کے مطابق نہایت متبرک جگہ تھی اور جہاں عام لوگوں کو جانے کی اجازت نہیں تھی۔ منور علی خان نے اپنے والد کو اٹھا کر اس بڑے تخت پر بٹھایا جو اسٹیج کا کام دے رہا تھا۔

Marfat.com

L to R Budikins (daughter of Malti), Munawar Ali Khan,
Radha (daughter of Malti), Bade Ghulam Ali Khan Sahib,
Begum Azmath (wife of Munawar Ali Khan), Raza Ali, Malti Gilani

A concert in the Gilanis' home in Calcutta
L to R Amir Ali Khan, Munawar Ali Khan, Ustad Wajid Husain
(nephew of Bade Ghulam Ali Khan Sahib),
Bade Ghulam Ali Khan Sahib, Prasun Chatterjee
and Afaq Husain

منور صاحب نے تان پورہ اور دیگر سازندوں نے اپنے ساز سنبھالے۔ اسی دوران گرو سوامی اندر آیا۔ خاموشی سے مسکراتے ہوئے اس نے ایک گلاب خان صاحب کے قدموں میں رکھا اور ان کے سامنے نیچے بیٹھ گیا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں اور

Marfat.com

مراقبے کی سی کیفیت میں چلا گیا۔ وہاں موجود تمام مرد اور عورتیں گویا خان صاحب کے مقام اور مرتبے سے واقف تھیں۔ خان صاحب نے راگ پہلو میں اس مقبول بھجن سے محفل کا آغاز کیا:

رادھے کرشنا بول' تیرا کیا لگے گا مول؟
دس بیس کوس نہیں چلنا' تیرا ہاتھ پیر نہیں ہلنا
تو من کی کنڈی کھول' تیرا کیا لگے گا مول؟
تو رادھے کرشنا بول .....

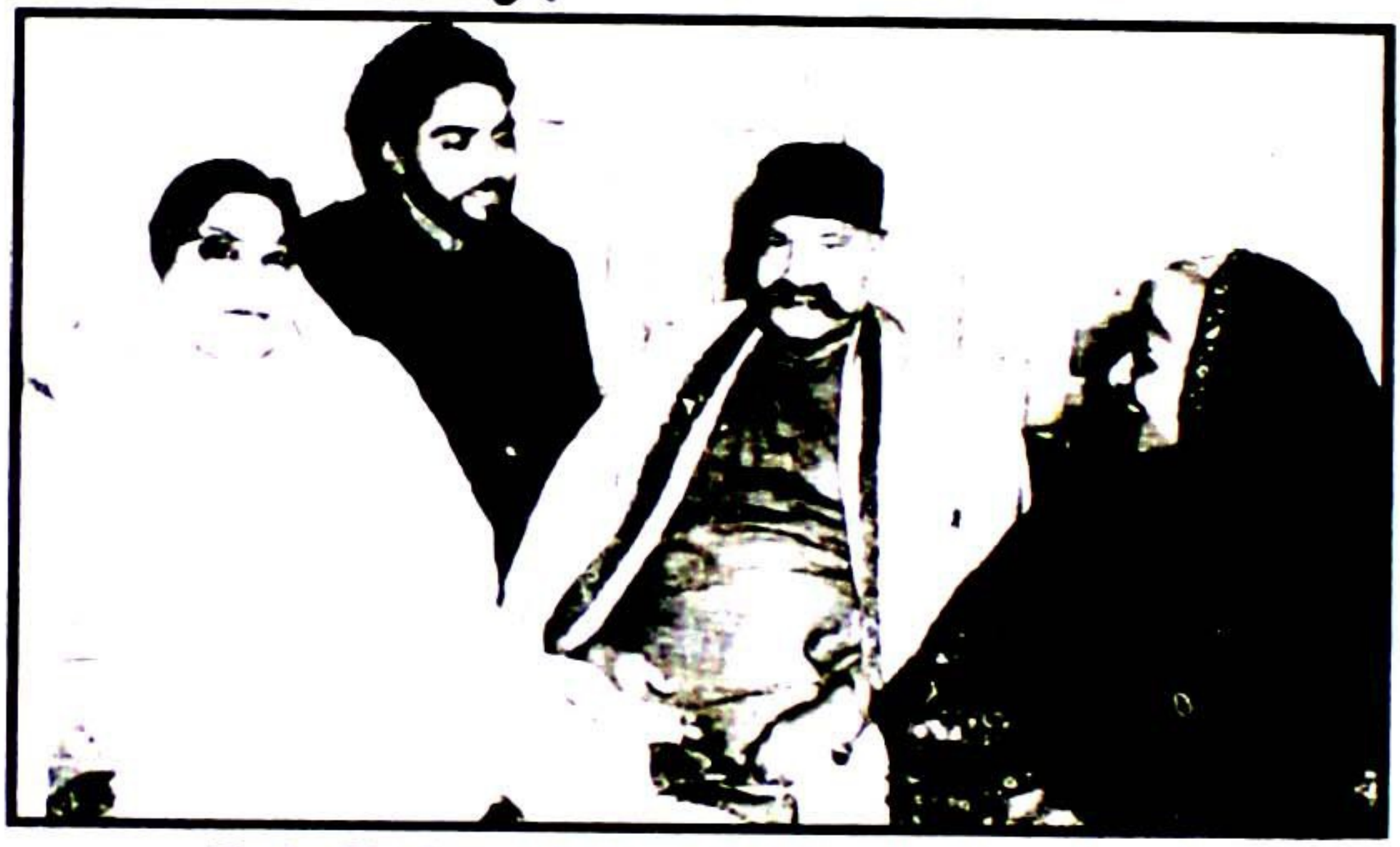

Bade Ghulam Ali Khan Sahib with Yaspal and Begum Allah Rakhi at Harballab Music Festival in Jullundur in Punjab

خان صاحب نے ہر بول کئی کئی انداز سے گایا اور ایک سماں باندھ دیا۔ آشرم کی فضا ہی عجیب ہوگئی۔ سادھو مردوں اور عورتوں پر وجد کی سی کیفیت طاری تھی بیشتر افراد کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ خان صاحب نے بھجن ختم کیا تو گرو اپنی جگہ سے اٹھا۔ اس کے رخساروں پر بھی آنسوؤں کی لکیریں بہہ رہی تھیں۔ اس نے سونے کی ایک چین خان صاحب کے قدموں میں رکھی اور جس طرح خاموشی سے آیا تھا' اسی

Marfat.com

طرح خاموشی سے واپس چلا گیا۔

بڑے غلام علی خان صاحب مذہبی عقائد کے معاملے میں وسیع القلبی کا مظاہرہ کرنے کے قائل تھے۔ انہیں احساس تھا کہ تمام مذاہب کے لوگ اپنے اپنے مذہب کے لئے احترام چاہتے تھے اور کسی کے مذہب کا احترام کیے بغیر اپنے مذہب کے لئے احترام کی توقع نہیں رکھی جا سکتی۔ ویسے بھی اس زمانے میں کافی حد تک مذہبی رواداری اور بھائی چارہ موجود تھا۔ مختلف مذاہب کے لوگ ایک دوسرے کا دل رکھنے کے لئے ایک دوسرے کے مذہب کے بارے میں خیر سگالی اور خوش دلی کا اظہار کرنے کی کوشش کرتے تھے۔

جن دنوں خان صاحب کو کہیں سے گانے کا بلاوانہ آتا' وہ بچوں کی سی معصومیت کے ساتھ مجھ سے کہتے "پتر! تمہارا ڈرائنگ روم بہت بڑا ہے ..... کیوں نہ تم اپنے دوستوں اور جاننے والوں کو مدعو کر کے وہاں ایک محفل رکھ لو ..... میں گانا سناؤں گا .....تمہاری لماں (بیگم اللہ رکھی) سب مہمانوں کے لئے کھانا پکائے گی۔ کچھ وقت ہنسی خوشی گزر جائے گا۔"

ان کی اس بات سے ظاہر ہوتا تھا کہ گانا ان کے لئے محض روپیہ کمانے کا ذریعہ نہیں تھا۔ کئی بار ہم نے ان کی اس تجویز پر عمل کیا اور میرے گھر کے ڈرائنگ روم میں موسیقی کی یادگار محفلیں جمیں جن میں لوگ دور دور سے آتے تھے اور اور گھر مہمانوں سے کھچا کھچ بھر جاتا تھا۔ میرے لئے یہ بڑا اعزاز ہوتا تھا کہ میرے استاد' میرے گرو' میرے گھر پہ گانے کے لئے آرہے ہیں اور اتنی بڑی تعداد صاحبانِ ذوق انہیں سننے کے لئے دور دور سے آرہے ہیں۔

Marfat.com

فالج کے بعد گوکہ وہ نہانے' دھونے اور اپنے نجی کاموں کے سلسلے میں دوسروں کے ..... اور خصوصاً لماّں کے محتاج ہو گئے تھے۔ اس کے باوجود وہ کسی بھی محفل میں اسٹیج پر آنے کے لئے خصوصی اہتمام کرتے تھے اور پوری کوشش کرتے تھے کہ معذور یا بدحال نظر نہ آئیں۔ وہ شیو بناتے' صاف ستھرے کلف لگے کپڑے زیب تن کرتے' بالوں اور مونچھوں کو خضاب یا مہندی لگاتے۔ زیادہ تر وہ بہترین بوسکی کی شلوار قمیض پہنتے۔ میرے گھر پر منعقد ہونے والی ایسی پہلی محفل میں مشہور ڈانسر ریکھا دیوی' مشہور صحافی اندر ملہوترا اور اس طرح کے دوسرے بہت سے ممتاز افراد شریک ہوئے تھے۔ افسوس ..... کہ ان دنوں وڈیو کیمرے عام نہ ہونے کی وجہ سے ان محفلوں کی ریکارڈنگ نہیں کی جا سکی تاہم آڈیو ریکارڈنگز موجود ہیں۔

اپنے گھر پر بھی خان صاحب اسی طرح خانقاہ کا سا منظر تخلیق کیے رکھتے تھے۔ ان کی پوری کوشش ہوتی تھی کہ گھر کے دروازے سب کے لئے کھلے رہیں' لوگ آتے جاتے رہیں' لنگر چلتا رہے اور وقت ہنسی خوشی گزرتا رہے۔ اندر سے وہ ایک صوفی تھے۔ صوفیوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ ہر وقت خوش' اپنے آپ میں مگن اور اپنے حال میں مست رہتے ہیں۔ ان میں اکڑ' نخوت' شان و شوکت کا احساس' غصہ' نفرت اور تاسف جیسے جذبے نہیں ہوتے۔ وہ سب سے محبت کرتے ہیں اور ان میں بے پناہ قوت برداشت ہوتی ہے۔ انڈیا کے چشتیہ سلسلے کے صوفیوں کے معمولات میں موسیقی کو بھی کافی دخل رہا۔ اس عمل دخل کے نتیجے میں قوالی نے جنم لیا۔

محرم کے دنوں میں خان صاحب گاتے نہیں تھے۔ صرف مجلسوں میں نوحے اور مرثیے پڑھتے۔ عشرے کے دوران میں ان کے گھر کے باہر ایک بڑے سے مٹکے

Marfat.com

میں شربت رکھا جاتا۔ خان صاحب اکثر خود کرسی پر بیٹھ کر آنے جانے والوں کو شربت پیش کرتے۔ عجیب بات تھی کہ اس زمانے میں مسلمانوں کے ساتھ ساتھ ہندو اور سکھ بھی محرم کے عشرے میں گھروں کے سامنے شربت کی سبیل لگاتے تھے۔ دوسری طرف کرشن جی کے جنم دن کے موقعے پر خان صاحب کو بنگال کے بہت سے ممتاز افراد کے گھروں میں گانے کے لئے مدعو کیا جاتا جہاں علامتی طور پر جھولا لٹکا ہوتا۔ خان صاحب اس موقعے پر بھی گانے سے انکار نہیں کرتے تھے۔ ان دنوں ہندوستان کے بیشتر علاقوں کی مذہبی اور ثقافتی فضا کافی حد تک اسی قسم کی تھی۔

.....☆.....

Ustad Bade Ghulam Ali Khan and Malti Gilani

Marfat.com

علی پور جیل میں ایک منفرد محفلِ موسیقی

1965ء کے موسم سرما میں خان صاحب کو علی پور جیل میں گانے کے لئے مدعو کیا گیا جہاں بڑے بڑے خطرناک قیدی اور پرتشدد جرائم میں ملوث مجرم قید تھے۔ خان صاحب کو ان سب کے سامنے گانا تھا۔ خان صاحب جیسے امن پسند اور شریف النفس انسان کے لئے یہ اچھا خاصا مشکل کام تھا۔ وہ چاہتے تو انکار بھی کر سکتے تھے .....مگر انہوں نے ایسا نہیں کیا اور دعوت قبول کر لی۔

خان صاحب اپنے شاگردوں اور سازندوں کے ساتھ جیل پہنچے تو بڑے آہنی گیٹ پر جیل کے عملے اور رضا کاروں نے ان کا استقبال کیا جو درحقیقت قیدی ہی تھے۔ سال میں ایک مرتبہ جیل میں محفل موسیقی منعقد کی جاتی تھی۔ اس موقعے پر قیدیوں کو جیل کی وردی کے بجائے عام کرتا دھوتی پہننے کی اجازت ہوتی تھی اور وہ جیل کی چار دیواری میں آزادانہ ادھر ادھر گھوم پھر بھی سکتے تھے۔ سنٹرل بیورو آف انوسٹی گیشن کے اس وقت کے ڈائرکٹر شری رتن مکر جی نے مجھے بتایا کہ اس تقریب کا انعقاد ان کے اور جیل کے عملے کے لئے ایک بڑی آزمائش ہوتا تھا۔ اس موقع پر کوئی بڑی گڑ بڑ بھی ہو سکتی تھی جس کے لئے انہیں تیار رہنا پڑتا تھا جبکہ بہت سی بڑی بڑی معزز اور مقتدر شخصیات بھی اس محفل میں شرکت کے لئے آتی تھیں۔ سیکیورٹی کے اندیشوں اور

Marfat.com

گڑ بڑ کے خوف سے اکثر فنکار اس تقریب میں آنے سے انکار کر دیتے تھے مگر خان صاحب جیسے مرنجاں مرنج فنکار ان اندیشوں کو خاطر میں نہیں لائے تھے۔

بہت بڑے پنڈال میں قیدی رضا کاروں نے ہی خان صاحب کی وہیل چیئر کو اسٹیج تک پہنچایا۔ وہ یہ خدمت انجام دیتے وقت بڑے خوش نظر آ رہے تھے۔ پنڈال اور اسٹیج خوب سجا ہوا تھا۔ جلد ہی ہمارا یہ احساس مٹ گیا کہ ہم خطرناک قیدیوں کے ہجوم کے سامنے بیٹھے ہیں۔ میرے لیے یہ ایک انوکھا تجربہ تھا۔ خان صاحب نے راگ مالکونس سے گانے کا آغاز کیا۔ قیدی بھی اتنے باذوق تھے کہ کلاسیکی کو ہمہ تن گوش ہو کر سن رہے تھے۔ کوئی اپنی جگہ سے جنبش تک نہیں کر رہا تھا۔ وہ لوگ گویا پلکیں تک جھپکانا بھول گئے تھے۔ خان صاحب گویا اپنی گائیکی کے ذریعے ان راندۂ درگاہ لوگوں کے دلوں تک امن، محبت اور شفقت کا پیغام پہنچانے کی کوشش کر رہے تھے۔

گانا ختم ہونے پر داد دینے اور تالیاں بجانے کے معاملے میں قیدیوں کا جوش و خروش دیدنی تھا۔ وہ خان صاحب سے مسلسل گائے جانے پر اصرار کر رہے تھے۔ وہ تو گویا چاہتے ہی نہیں تھے کہ محفل اختتام کو پہنچے۔ خان صاحب نے حسب روایت وہاں بھی سماں باندھ دیا۔ جیل کے عملے سمیت سامعین خان صاحب کو سن کر بہت خوش نظر آ رہے تھے۔

بڑی مشکل سے محفل موسیقی کو اختتام تک پہنچایا گیا جس کے بعد کھانے کا انتظام تھا۔ قیدیوں کو تو فرش پر بٹھایا گیا تھا تاہم جیل کے اسٹاف، خان صاحب اور ہم لوگوں کے لئے ایک لمبی میز لگائی گئی تھی۔ دلچسپ بات یہ تھی کہ دو نہایت خطرناک مجرم، رضا کاروں والے بیج لگائے، خان صاحب کی وہیل چیئر کے دائیں بائیں کھڑے ان

Marfat.com

کے باڈی گارڈز کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ اسی طرح کے کچھ اور خطرناک غنڈے خان صاحب کے لئے کھانے لالا کر بطور خاص اور بصد اصرار انہیں کھلانے کی کوشش کر رہے تھے۔ کھانا ختم ہوا تو انہی سب لوگوں نے بڑی عزت و تکریم سے ہمیں ہماری کاروں تک پہنچایا۔ ان میں سے بیشتر ہمیں خدا حافظ کہتے وقت بنگالی میں نعرے لگا رہے تھے ''ابارا شبین .....'' جس کا مطلب تھا'' دوبارہ بھی ضرور آیئے گا .....''

رخصت ہوتے وقت خان صاحب اداس نظر آ رہے تھے۔ ان کے اندر کا رحم دل انسان بے چین تھا۔ انہوں نے ہم سے کہا''ان انسانوں کی بدقسمتی ہے کہ کسی غلطی یا حالات کے جبر کے نتیجے میں انہیں موٹی موٹی دیواروں اور آہنی سلاخوں کے پیچھے زندگی گزارنا پڑ رہی ہے۔ ہم کتنے خوش نصیب ہیں کہ آزادی کی فضا میں سانس لے رہے ہیں۔''

اس روز خان صاحب کی انسان دوستی اور خداترسی مجھ پر کچھ اور واضح ہوئی۔ میں ان کی شخصیت کے اس پہلو سے کچھ اور متاثر ہوئی۔ وہ معاشرے کے ٹھکرائے ہوئے لوگوں کے لئے بھی دل گرفتہ اور اداس تھے۔ ان کی انہی اعلیٰ صفات نے انہیں مزید بڑا انسان بنا دیا تھا۔

دوسرے روز میں معمول کے مطابق گائیکی کی ''تعلیم'' کے لئے خان صاحب کے ہاں پہنچی تو وہ گزشتہ روز کی طرح بڑے اہتمام سے تیار ہوئے بیٹھے تھے۔ میں سمجھ گئی کہ وہ کہیں باہر جانا چاہتے ہیں۔ پتا چلا کہ وہ ''اماں'' کے لئے کوئی تحفہ خریدنے کی غرض سے زکریا اسٹریٹ جانا چاہتے ہیں۔ کلکتہ کا یہ بازار کڑھائی والے کرتوں اور زنانہ

Marfat.com

کپڑے کے لئے خاص طور پر مشہور تھا۔ مرشد آباد سے آنیوالی نہایت خاص قسم کی ریشمی ساڑھیاں بھی وہاں سے ملتی تھی۔ میں خان صاحب کو گاڑی میں زکریا اسٹریٹ لے گئی۔ وہ چونکہ معذوری کے سبب گاڑی سے نہیں اتر سکتے تھے اس لئے میں نے دکاندار کو ہی گاڑی کے پاس بلوایا جو بڑے غلام علی خان صاحب کا نام سن کر خوشی خوشی چلا آیا۔ اس کی دکان ایک خاص ریشمی کپڑے کے لئے مشہور تھی جسے ''پیاز کا چھلکا'' کہا جاتا تھا۔ وہ واقعی پیاز کے چھلکے کی طرح باریک' نفیس اور ملائم ہوتا تھا۔ خان صاحب دکاندار سے بات کرنے لگے تو کئی راہ گیر بھی خان صاحب کو پہچان کر رک گئے اور ''آداب ..... آداب'' کرنے لگے۔ بازار ویسے ہی تنگ اور گنجان تھا۔ اس میں اچھی خاصی بھیڑ لگ گئی۔ خان صاحب اس احساس سے بچوں کی طرح خوش نظر آنے لگے کہ عوامی مقامات پر انہیں بھی فلم اسٹارز کی طرح پہچان لیا جاتا تھا۔

دکاندار نے خان صاحب کے سامنے نفیس اور عمدہ ساڑھیوں کے ڈھیر لگا دیے۔ انہوں نے ان میں سے اماں کے لئے دو منتخب کیں۔ تاہم وہ تمام ساڑھیوں کی تعریف کرتے رہے۔ وہ ہر قسم کی ہنر مندی کے مظاہرے دیکھ کر بے حد خوش ہوتے تھے اور دل کھول کر ہنر مندوں کی تعریف کرتے تھے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ تمام ہنر اپنی اپنی جگہ اہم ہیں اور کسی بھی ہنر میں کمال حاصل کرنے والا قابل ستائش ہے۔ گھر آ کر انہوں نے شریر بچوں کی طرح سسپنس پیدا کرتے ہوئے پیکٹ اماں کو دیا لیکن یہ نہیں بتایا کہ اس میں کیا تھا؟ اماں نے جب پیکٹ کھول کر ساڑھیاں دیکھیں تو وہ بھی بچوں کی طرح خوش نظر آنے لگیں۔

ایک روز ایک آدمی خان صاحب سے ملنے آیا جس نے دعویٰ کیا کہ وہ ان

Marfat.com

کے فالج کا علاج کر سکتا ہے۔ خان صاحب بعض اوقات لچھے دار باتیں کرنے والوں کی باتوں میں آسانی سے آجاتے تھے۔ اس دن کے بعد سے میں ان کے ہاں جاتی تو انہیں ہاتھ پاؤں حتی الامکان اونچے کیے' تخت پر لیٹے دیکھتی۔ ان کے جسم میں لکڑی کی سوٹیاں پیوست ہوتیں۔ اپنی تکلیف کی طرف سے دھیان ہٹانے کے لئے وہ نیچی آواز میں بھیرویں گاتے رہتے۔ بدقسمتی سے ان کا فالج ''ایکوپریشر'' نامی اس علاج سے بھی دور نہیں ہو سکا اور انہیں باقی زندگی اسی معذوری کی حالت میں گزارنی پڑی۔ قدرت ان کی افسردگی کے اسباب کرتی رہتی تھی۔ انہی دنوں حیدرآباد کے نواب ظہیر یار جنگ نے انہیں اپنے ہاں آنے کی دعوت بھیج دی۔ نواب صاحب' خان صاحب کے زبردست پرستار تھے۔ وہ ان کے بھائی برکت علی خان کے بھی مداح تھے۔ نواب صاحب خود بھی بڑے ماہر طبلہ نواز تھے اور ماضی میں نجی محفلوں میں دونوں بھائیوں کے گانے کے دوران میں طبلے پر ان کی سنگت کرتے رہے تھے۔ دونوں بھائیوں سے نواب صاحب کی گہری دوستی ہو گئی تھی اور ان کے درمیان گھنٹوں موسیقی کے بارے میں باتیں ہوتی رہتی تھیں۔ نواب صاحب سکندر آباد میں ''پائے گاہ ہاؤس'' میں اپنی بڑی بیگم کے ساتھ رہتے تھے جو دنیا کی حسین ترین خواتین میں شمار ہوتی تھیں۔ ان کے جوان بچے بھی ان کے ساتھ رہتے تھے۔

نواب صاحب کی دعوت پر خان صاحب اپنی فیملی سمیت حیدرآباد دکن روانہ ہو گئے۔ گوکہ ان کی طبیعت بہتر نہیں تھی لیکن انہوں نے خود کو متحرک رکھنے کے خیال سے سفر اختیار کر لیا تھا۔ اس کے علاوہ وہ نواب صاحب کے ایک فیملی فرینڈ' نہایت مشہور معالج' ڈاکٹر عبدالمنان سے چیک اپ کرا کے طبی مشورہ بھی لینا چاہتے تھے۔ ریلوے اسٹیشن پر

Marfat.com

نواب صاحب کے بھتیجے نے ان کا اور ان کے اہل خانہ کا استقبال کیا۔ انہیں "بشیر باغ" لے جایا گیا جو نواب صاحب کی جاگیر تھی۔ اس جاگیر کا نام ان کے دادا بشیر الدولہ کے نام پر "بشیر باغ" رکھا گیا تھا۔ یہاں نواب صاحب کی ایک حویلی بھی تھی جس میں وہ شکار کے دوران قیام کیا کرتے تھے۔ یہ حویلی ان کی چھوٹی بیگم فرید جہاں کی قیام گاہ بھی تھی۔

دوسرے روز نواب صاحب' خان صاحب سے ملاقات کے لئے آئے۔ دونوں کے درمیان بے تکلفانہ اور دوستانہ ماحول میں گپ شپ ہوئی۔ دونوں برابری کی سطح پر ملتے تھے۔ خان صاحب ویسے بھی کسی بھی نواب سے مرعوب نہیں ہوتے تھے۔ ان کا کہنا تھا "اگر نوابوں کے پاس جاگیریں ہیں تو میرے پاس بھی موسیقی کی جاگیر ہے۔"

حیدر آباد میں نواب صاحب کے ساتھ موسیقی کی نجی محفلوں کے علاوہ کئی عوامی محفلیں بھی منعقد ہوئیں لیکن خان صاحب جلد ہی اپنے گھر کے بے تکلفانہ اور آرام دہ ماحوم میں واپس آنے کے لئے بے قرار ہو گئے جہاں ان کے مداحوں' ملاقاتیوں اور شاگردوں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ ان کی واپسی کی خبر سن کر میں ہاوڑہ ریلوے اسٹیشن پر انہیں لینے پہنچی۔

ٹرین آ گئی اور بیشتر مسافر اتر گئے مگر مجھے خان صاحب یا ان کے کنبے کا کوئی فرد کہیں نظر نہیں آیا۔ پھر میں نے سفید بالوں والے ایک دبلے اور لمبے سے آدمی کو اپنی طرف آتے دیکھا تو اس سے پوچھ لیا "معاف کیجئے گا ..... کیا آپ حیدر آباد سے آئے ہیں؟"

Marfat.com

''ہاں۔'' اس نے جواب دیا۔

Khan Sahib loved Amir Ali as he was the grandson of Ustad Kale Khan Sahib. Amir Ali was always caring and served Khan Sahib as a devoted disciple

تب میں نے مزید ہمت کر کے اس سے پوچھ لیا ''کیا آپ کو معلوم ہے کہ بڑے غلام علی خان صاحب اس ٹرین سے آئے ہیں یا نہیں؟''

''مجھے معلوم نہیں.....'' اجنبی نے جواب دیا ''لیکن آپ چاہیں تو ہم چل

Marfat.com

کر دیکھ سکتے ہیں۔"

Ustad Imrat Khan

اس کا ساتھ مِلا تو میں نے حوصلہ کر کے پوری ٹرین دیکھ ڈالی لیکن خان صاحب وغیرہ کہیں نہیں تھے۔ مجھے بڑی مایوسی ہوئی۔ وہ اجنبی جس نے اس تلاش میں میرا ساتھ دیا تھا۔ خود بھی ایک استاد معلوم ہو رہا تھا اور اس کی شخصیت متاثر کن تھی۔ میں نے اسے پیشکش کی "آپ کو جہاں جانا ہے، میں اتار دوں گی۔"

اس نے بلاتامل میری پیشکش قبول کر لی۔ اس کے پاس کوئی سامان نہیں تھا۔ بس

Marfat.com

کپڑے کا ایک تھیلا اس کے کندھے پر لٹکا ہوا تھا۔ کار میں سفر کے دوران میں ہم دونوں خاموش رہے۔ اجنبی بے حد کم گو معلوم ہوتا تھا۔ پارک اسٹریٹ آئی تو اس نے کہا ''مجھے یہاں اتار دیجئے ..... یہاں اشوکا گیلری میں میری پینٹنگز کی نمائش ہو رہی ہے۔''

مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ وہ ایک آرٹسٹ تھا۔ اس نے اپنا تعارف مقبول فدا حسین کے نام سے کرایا ..... جی ہاں ..... یہ آج کے مشہور زمانہ آرٹسٹ ایم۔ ایف حسین تھے۔ اس وقت سے لے کر آج تک ہمارے درمیان دوستانہ مراسم چلے آرہے ہیں۔ مجھے ان کی مصوری بہت زیادہ پسند ہے۔

چند دن بعد خان صاحب حیدر آباد سے واپس آ گئے اور ان کے ساتھ ان کے فلیٹ کی رونقیں بھی لوٹ آئیں۔ جمعہ کے دن تو اپنے اپنے میدان کے کئی بڑے استاد جمع ہو جاتے اور ایک دوسرے کو اپنے اپنے فن کی نئی جہتوں سے روشناس کراتے۔افسوس ..... کہ اب اس طرح کی محفلیں دیکھنے میں نہیں آتیں! فروری 1966ء میں بسنت پنچھمی یا سرسوتی پوجا کا تہوار آیا۔عرف عام میں اِسے صرف بسنت کا تہوار بھی کہا جاتا ہے۔ اس موقع پر استاد ولایت خان کے گھر پر ایک بڑی محفل منعقد ہوئی جس کے بعد کھانے کا بھی اہتمام تھا۔ اس محفل میں بڑے بڑے فنکاروں نے راگ بسنت اور راگ بہار مختلف انداز سے سنائے۔ آدھی رات کے بعد خان صاحب بھی تشریف لائے اور انہوں نے محفل کو چار چاند لگا دیے۔ انہوں نے مغل دور کی' صد رنگ کی ایک بندش پنجابی میں راگ بسنت میں سنائی پھر امیر خسرو کا کلام سنایا:

سکل بن پھول رہی سرسوں

خان صاحب کو اس قسم کے گیتوں کی وجہ سے پنجاب کے لہلہاتے سرسبز

Marfat.com

کھیتوں کی یاد ستاتی تھی۔ قصور کی وہ گلیاں گویا انہیں بلاتی تھیں جہاں ان کا بچپن اور جوانی بیتی مگر وہ سرزمین اب ان کے لئے پرائی ہو چکی تھی۔ پاکستان ان کے لئے ''غیر ملک'' تھا۔ انہیں معلوم تھا کہ ان کی زندگی کی شام ڈھل رہی ہے اور وہ سوچا کرتے تھے کہ نہ جانے انہیں زندگی کے آخری دنوں میں اپنی آبائی سرزمین کو دیکھنا نصیب ہوگا یا نہیں ..... جبکہ ڈاکٹرز کو یہ بھی ایک معجزہ محسوس ہوتا تھا کہ وہ ایک فالج زدہ انسان ہوتے ہوئے اس عمر میں' اس گھن گرج کے ساتھ گا رہے تھے۔ جبکہ خود ان کا اپنا موسیقی کے بارے میں کیا خیال تھا' یہ انہوں نے ایک روز خاصے اداس لہجے میں مجھے بتایا ''پتر! اب تو جا کر موسیقی کی کچھ کچھ سمجھ آنے لگی تھی ..... مگر اب جانے کا وقت آ گیا ہے۔ کچھ اور مہلت ملتی تو شاید تھوڑا بہت اور سیکھ لیتے ..... مگر انسان کی مشکل یہی ہے کہ وہ فانی ہے جبکہ موسیقی لافانی ہے۔ بہرحال ..... میں کچھ خزانہ تمہارے سپرد کیے جا رہا ہوں۔ اس کی حفاظت کرنا۔'' ان کی باتوں نے مجھے بھی اُداس کر دیا۔ ان جیسا استاد ہر ایک کو نصیب نہیں ہوتا۔ انہوں نے جس محنت سے ''میاں کی توڑی'' یا ''میاں کی ملہار'' مجھے سکھایا' وہ تو میں خاص طور پر کبھی نہیں بھول سکتی۔ تان سین' نے راگوں میں جو اختراعات کیں انہیں ''میاں کی توڑی یا میاں کی ملہار کہا جاتا ہے۔ اس میں لفظ ''میاں'' احتراماً خود تان سین کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔ خاص محفلوں میں خان صاحب راگوں کی جو باریکیاں جنہیں ''گپتھ'' کہا جاتا ہے' اساتذہ کو سمجھاتے۔ تھیوری کی حد تک تو بات اساتذہ کی سمجھ میں آجاتی لیکن اس کا عملی مظاہرہ کر کے وہ بھی نہیں دکھا سکتے تھے۔ یہ کام صرف خان صاحب کر سکتے تھے۔

.....☆.....

Marfat.com

شعلہ بجھنے سے پہلے

رمضان کا مہینہ مسلمانوں کے عقائد کے مطابق بے پناہ محترم و مقدس ہے۔ اس میں زیادہ سے زیادہ عبادت اور نیک کام کر کے' زیادہ سے زیادہ ،خیرات کر کے اپنی ذات کی تطہیر کی جاتی ہے اور زیادہ سے زیادہ ثواب کمایا جاتا ہے۔ اس مہینے میں خان صاحب کے معمولات بھی بدل جاتے۔ امّاں زیادہ سے زیادہ افطاری تیار کرتیں۔ مہمان بھی آتے اور روزہ افطار کرتے۔ افطاری مسجد میں بھی بھیجی جاتی۔ گھر میں خوب گہما گہمی رہتی۔ مہینے میں ایک دو بار خان صاحب بریانی کی دیگ بھی تیار کرا کے مسجد کے سامنے لے جاتے اور خود کرسی پر بیٹھ کر اپنے ہاتھ سے فقراء اور مساکین میں تقسیم کرتے۔

پھر عید کا چاند نظر آتا تو گھر کے افراد' مہمانوں اور احباب کا جوش و خروش اور خوشی دیدنی ہوتی۔ ایک دوسرے کو مبارک باد دی جاتی۔ شیرینی تیار ہوتی اور محلے پڑوس میں تقسیم کی جاتی۔ عید کے روز نماز کے بعد خان صاحب تیار ہو کر تخت پر منتظر انداز میں بیٹھ جاتے۔ یکے بعد دیگرے دوست' احباب' جن میں زیادہ تر ماہرین فن ہوتے' آتے جاتے اور خان صاحب سے عید ملتے۔ گھر میں میلے کا سا سماں ہوتا۔ تخت پر خان صاحب یوں بیٹھے دکھائی دیتے جیسے وہ شہنشاہ اکبر ہوں اور سامنے ان کا دربار سجا ہو۔

Marfat.com

یہ امر حیرت انگیز تھا کہ خان صاحب نارتھ انڈیا میں اپنی زندگی کا بیشتر حصہ گزارنے کے بعد بنگال میں آ کر بھی اسی طرح رچ بس گئے تھے جیسے وہ ان کا گھر ہو۔ وہ یہاں کے کلچر میں اجنبی دکھائی نہیں دیتے تھے۔ اس اعتبار سے وہ خوش قسمت تھے کہ یہاں بھی انہیں وہ سب کچھ حاصل تھا جس کی ایک انسان تمنا کر سکتا ہے۔ ایک عظیم فنکار والا مقام و مرتبہ' محبت کرنے والی فیملی اور چاہنے والے دوست۔

Ustad Bade Ghulam Ali and Munawar in concert

ان کے اخراجات خاصے تھے لیکن آسانی سے پورے ہو جاتے تھے۔ انہیں کوئی تنگی نہیں تھی۔ وہ جو کچھ بھی چاہتے' ان کے دوست' احباب اور قدر دان مہیا کرنے کے لئے تیار رہتے تھے لیکن اس سے زیادہ کی انہیں طلب ہی نہیں تھی۔ میں بتا چکی ہوں کہ بنیادی طور پر وہ درویش صفت آدمی تھے۔ روپے پیسے اور مادی آسائشوں سے زیادہ ان کی نظر میں دوستوں' قدردانوں' چاہنے والوں' رشتے ناتوں اور جذبات و احساسات کی اہمیت تھی۔ البتہ ایک خواہش ان میں شدید تھی ..... اور وہ تھی صحت یاب ہونے کی خواہش۔

Marfat.com

وہ اکثر کہا کرتے ''مجھے بڑی شرمندگی محسوس ہوتی ہے جب منور مجھے گود میں اٹھا کر اسٹیج پر پہنچاتا ہے۔ میں اچھا خاصا بھاری بھرکم آدمی ہوں۔ مجھے ڈر ہے' مجھے اٹھاتے اٹھاتے کسی روز خود منور کے کہیں موچ نہ آجائے یا اس کا کوئی پٹھا نہ چڑھ جائے۔''

**Seated - Pandit Prashar, Patal Babu, Raza Ali,
Bade Ghulam Ali Khan, Munawar Ali,
Shankar Babu, Imrat Khan, Mame Adhrija Mukherjee**

باپ بیٹے کے درمیان بلا کی والہانہ وابستگی تھی۔ منور کے لئے گویا خان صاحب ہی سب کچھ تھے۔ انہوں نے بلاشبہ باپ کی بڑی خدمت کی۔ باپ بیٹا اسٹیج پر بھی اکٹھے گاتے تھے۔ خان صاحب جہاں تان چھوڑتے' منور وہیں سے اسے پکڑتے۔ ہر معاملے میں منور گویا خان صاحب کی آنکھ کا اشارہ سمجھے جاتے تھے۔ منور خود بہت بڑے فنکار بن چکے تھے لیکن یہ ان کی سعادت مندی اور عظمت تھی کہ وہ کبھی کسی محفل میں اکیلے گانے کی دعوت قبول نہیں کرتے تھے کہ کہیں باپ کو یہ احساس نہ ہو کہ بیٹے نے باپ کی انگلی پکڑ کر چلنے کے بجائے' اپنے آپ کو خود مختار سمجھ کر اکیلے چلنا شروع کر

Marfat.com

دیا ہے۔ وہ باپ کے زیر سایہ رہ کر ہی فخر محسوس کرتے تھے۔

Ustad Bade Ghulam Ali Khan, Raza Ali, Munawar Ali

صحت یابی کی امید پر خان صاحب ہر طریقہء علاج اور ہر مشہور معالج کو آزمانے کے لئے تیار رہتے تھے۔ ایک بار کسی نے انہیں ایک وید کے بارے میں بتایا کہ وہ ہر بیماری کا علاج کر سکتا ہے۔ بتانے والے نے وید کے کراماتی علاج کے بہت سے قصے سنائے۔ دوسرے روز خان صاحب میری گاڑی میں بیٹھ کر اس وید سے ملنے روانہ ہو گئے۔ وہ اگلی سیٹ پر ڈرائیور کے ساتھ بیٹھے تھے اور ابھی سے انہوں نے اپنی صحت کی امید لگا لی تھی' اس لئے بہت خوش نظر آ رہے تھے۔ خوب چہک رہے تھے۔ لطیفے سنا رہے تھے' دلچسپ باتیں کر رہے تھے اور راستے میں نظر آنے والی تمام فطری چیزوں کا زاگوں سے تعلق بیان کرتے جا رہے تھے۔

وید' ڈم ڈم ائیر پورٹ سے آگے' مضافات میں ایک جگہ بڑے سے جھونپڑے میں رہتا تھا۔ ایک گھنٹے کی ڈرائیو کے بعد جب ہم وہاں پہنچے تو وید کے جھونپڑے کے سامنے دیہاتی مریضوں کی طویل قطار نظر آئی تاہم خان صاحب کی آمد

Marfat.com

کی اطلاع سن کر وید نے اپنے اسسٹنٹ کو بھیجا کہ وہ کار ہی میں تشریف رکھیں' وہ خود وہیں آ کر ان کا معائنہ کر لے گا۔ اس نے ہم لوگوں کے لئے چائے بھی بھجوائی۔ اس خصوصی سلوک پر خان صاحب بہت خوش ہوئے لیکن پھر مریضوں کی اتنی لمبی قطار دیکھ کر افسردہ بھی ہو گئے کہ اتنے بہت سے لوگ بے چارے نہ جانے کن کن بیماریوں میں مبتلا تھے۔ وہ اپنی بیماری بھول کر ان کے بارے میں باتیں کرنے لگے۔ واقعی وہ اسی قسم کے لوگوں میں سے تھے جن کے بارے میں کہا گیا ہے۔

ع سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

وید ہر مریض کا معائنہ کرنے کے بعد اسے ایک دوسرے جھونپڑے میں بھیج دیتا تھا جہاں جڑی بوٹیوں کے انبار لگے ہوئے تھے اور دو ''کمپاؤنڈر'' بیٹھے تھے۔ وہ مریض کو نسخے کے مطابق جڑی بوٹیاں دیتے اور استعمال کا طریقہ سمجھاتے۔ مریضوں کو بہر حال کچھ نہ کچھ فائدہ ہوتا تھا تبھی اس وید کی شہرت دور دور تک پھیلی ہوئی تھی۔

کچھ دیر بعد وید' خان صاحب کے پاس آیا۔ منور کی زبانی اس نے بیماری اور اب تک کے علاج معالجے کی تفصیل سنی۔ نہایت سنجیدگی اور انہماک سے اس نے خان صاحب کا معائنہ کیا۔ اس دوران میں وہ یہ بھی بتاتا رہا کہ اس کے علاج سے کون کون سے دوسرے مشہور افراد کن کن بیماریوں سے نجات پا چکے تھے۔ یہ سن کر خان صاحب اور بھی زیادہ پر امید ہو گئے۔ منور اور ہمارا ڈرائیور نسخہ لے کر دوسرے جھونپڑے میں گئے' واپس آئے تو ان کے پاس جڑی بوٹیوں کی پوری ایک ٹوکری اور گھاس پھونس کا سا ایک گٹھا تھا۔

کئی ہفتوں تک لگاتار ہدایات کے مطابق یہ جڑی بوٹیاں وغیرہ ابال کر خان

Marfat.com

صاحب کو پلاتی رہیں اور ان کی حالت میں تھوڑا بہت فرق نظر آنے لگا۔ اب وہ اپنے فالج زدہ ہاتھ کو معمولی سی حرکت دے سکتے تھے اور جب تخت پر ٹانگیں لٹکا کر بیٹھے ہوتے تھے تو مفلوج ٹانگ کو تھوڑا بہت' آگے پیچھے ہلا سکتے تھے۔ خان صاحب کی خوشی کی انتہا نہ تھی۔ جڑی بوٹیاں ختم ہو جاتیں تو ڈرائیور جا کر اور لے آتا۔ سب کو خان صاحب کی صحت یابی کی امید ہو چکی تھی۔ خان صاحب بھی یہی کہتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی دعائیں سن لی ہیں اور مولا مشکل کشا نے کرم کر دیا ہے۔ اس خوشی میں ماما مکرجی کے شاندار مکان میں ایک محفل موسیقی بھی منعقد کر ڈالی گئی۔ ماما مکرجی نے اس موقعے پر اپنے طویل و عریض شاہانہ قسم کے مکان کو ڈھیروں پھولوں اور روشنیوں سے سجایا تھا۔ خان صاحب اور دیگر مہمانوں کے راستے میں بھی پھول بچھائے گئے تھے۔ یہ بھی ایک یادگار محفل موسیقی تھی جس میں گانے' کے دوران خان صاحب نے راگوں اور موسیقی کے بہت سے اسرار و رموز بھی بتائے۔ ایسے موقعوں پر وہ گویئے کے بجائے موسیقی کے ایک بہت بڑے پروفیسر معلوم ہونے لگتے تھے۔ خوش قسمتی سے میں اس موقعے پر جرمنی کی مشہور کمپنی "گزنڈگ' کا ٹیپ ریکارڈ بھی لے گئی تھی جسے اگر آج کے دور کے بچے دیکھیں تو عجوبہ محسوس کریں۔ میرے پاس اس تقریب کی ریکارڈنگ موجود ہے جو خاصے کی چیز ہے۔

اس کے چند ہفتے بعد خان صاحب کو شری دیو چڈھا کی طرف سے وشاکا پٹنم میں تسلسل سے کنسرٹ کرنے کی دعوت ملی۔ خان صاحب اس دعوت کو مسترد کرنے کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ وشاکا پٹنم سے وہ نواب ظہیر یار جنگ کے پاس حیدر آباد جائیں گے۔ مجھے یہ سن کر تشویش ہوئی۔ مجھے اندازہ تھا کہ ان کی

Marfat.com

صحت بہتر نہیں ہے۔ کلکتہ سے ٹرین کے ذریعے وشاکا پٹنم اورر پھر حیدر آباد کا طویل سفر آسان نہیں تھا۔ ادھر وید کے علاج سے تھوڑا بہت فائدہ نظر آ رہا تھا۔ اندیشہ تھا کہ سفر در سفر اور کنسرٹس کی مصروفیات مین یہ علاج بھی بیچ میں رہ جائے گا مگر اپنے اخراجات اور طرززندگی کے تقاضے پورے کرنے کے علاوہ متحرک اور فعالی رہنے کے لئے بھی وہ کنسرٹس میں جانا ضروری سمجھتے تھے۔صورت حال خاصی پیچیدہ تھی اور ایک امتحان گویا ان کے سامنے تھا۔آخر کار انہوں نے جانے کا فیصلہ کرلیا۔

بڑے غلام علی صاحب کا ٹرین کے ذریعے سفر پر روانہ ہونا کچھ ایسا ہی ہوتا تھا جیسے بادشاہ سلامت شکار پر ..... یا پھر کوئی نئی سرزمین فتح کرنے جا رہے ہوں۔ ان کے ساتھ بھی پورا لاؤ لشکر ہوتا تھا۔ اپنی فیملی، سازندے، شاگرد، دوست، ساتھی ..... اور کبھی تو خواہ مخواہ ساتھ جانے والے بھی اس لاؤ لشکر میں شامل ہوتے۔ باورچی اور دیگر ملازم بھی ہمراہ ہوتے۔ آج کے دور میں ایسے آدمیوں کا ..... اور ایسی باتوں کا تصور بھی محال ہے۔

اس بار ان کے ساتھ جانے والوں میں ان کے بھتیجے امیر علی خان بھی تھے جو کالے خان صاحب کے نواسے تھے۔ خان صاحب انہیں بہت عزیز رکھتے تھے اور گانے کے دوران میں ان کے ساتھ ہارمونیم پر وہی ہوتے تھے۔ ان کے علاوہ سازندوں میں بے مثال طبلہ نواز آفاق حسین تھے جو لکھنؤ کے واجد حسین کے صاحبزادے تھے۔مشہور سارنگی نواز استاد لڈن خان تھے۔

نومبر 1967ء کی ایک شام یہ لاؤ لشکر ہاوڑہ اسٹیشن پہنچا اور پورے پلیٹ فارم پر گویا بھونچال آ گیا۔ایک تو اتنے بہت سے افراد ..... پھر ہر ایک کے ساتھ

Marfat.com

ڈھیروں سامان ..... گٹھڑیاں، صندوق، ٹرنک، کئی اقسام کے ساز، ایک بہت بڑا منقش ٹفن کیریئر جو کسی مینار سے کم نہیں تھا ..... صراحیاں، لوٹے ..... اور نہ جانے کیا کچھ اس قافلے کے ساتھ تھا۔ حتیٰ کہ ایک صاحب پنجرے میں اپنا طوطا بھی ساتھ لے آئے تھے جو اپنی کرخت آواز میں خان صاحب کی مشہور ٹھمری گائے جا رہا تھا:

"آئے نہ بالم ..... کا کروں سجنی"

سب لوگ اپنی اپنی سیٹوں کی تلاش میں بوکھلائے ہوئے ادھر ادھر بھاگ رہے تھے جبکہ اماں ..... یعنی بیگم اللہ رکھی کسی ملکہ کی سی شان اور تمکنت سے قلیوں اور اپنی خادماؤں کو ہدایات دے رہی تھیں۔ خان صاحب ہماری کلہ میں اسٹیشن پہنچے تھے اور تمام راستے باتیں کرتے آئے تھے۔ اس مقام اور مرتبے کے لوگ خاص طور پر بڑی عمر کو پہنچ کر صرف اپنی ذات کے بارے میں باتیں کرتے ہیں لیکن خان صاحب ہمیشہ دوسروں کے بارے میں باتیں کرتے تھے۔ وہ ہر چھوٹے بڑے کی ذات میں دلچسپی لیتے تھے۔ انہیں وہیل چیئر پر پلیٹ فارم پر ..... اور پھر اٹھا کر ان کی سیٹ تک فرسٹ کلاس کمپارٹمنٹ میں پہنچایا گیا۔

عام طور پر وہ سیٹ پر بیٹھنے اور سنبھلنے کے فوراً بعد کھڑکی سے باہر دیکھنے لگتے تھے اور چیزوں پر تبصرے شروع کر دیتے تھے لیکن اس روز میں ان کے برابر بیٹھی تو وہ اچانک بولے "پتر! کاش تم بھی ہمارے ساتھ چلتیں۔"

ان کی آنکھوں میں نمی تھی۔ اس لمحے گویا کسی غیبی طاقت نے میرے کان میں سرگوشی کی کہ شاید میں خان صاحب کو آخری بار دیکھ رہی ہوں۔ ٹرین چلنے کو تھی میں نے ان کے پاؤں چھوئے اور ٹرین سے اتر آئی۔ ٹرین روانہ ہو گئی اور کھڑکی سے

Marfat.com

جھانکتا ہوا ان کا چہرہ ہماری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ میں بوجھل قدموں سے کار تک واپس آئی۔ ایک وہم سا دل میں بیٹھ گیا تھا جیسے خان صاحب کلکتہ سے نہیں' ہماری زندگیوں سے باہر جا رہے تھے۔ شاید اب کلکتہ واپس آنا ان کے نصیب میں نہیں تھا۔ میں اس احساس و ذہن سے جھٹکنے کی کوشش کرتے ہوئے گھر لوٹ آئی۔

.....☆.....

شری دیو چڈھا جو وشاکا پٹنم میں خان صاحب کے کنسرٹس کا اہتمام کر رہے تھے' بین الاقوامی کمپنی ''کالٹیکس'' میں بہت بڑے عہدے پر تھے اور خان صاحب کے زبردست پرستار تھے۔ وہ ''والیٹر اپ لینڈ'' میں ایک شاندار بنگلے میں رہتے تھے جو امراء کا علاقہ تھا۔ خان صاحب کو اپنے گھر میں مہمان ٹھہرانا بھی مسٹر چڈھا کی ایک بہت بڑی اور دلی آرزو تھی۔ وہ خان صاحب اور ان کی فیملی کے استقبال کے لئے بہ ذات خود ریلوے اسٹیشن پر موجود تھے اور انہوں نے استقبال کے نہایت ہی شاندار انتظامات کیے تھے۔ خان صاحب اور ان کی فیملی کو تو وہ اپنی گاڑی میں لے کر اپنے گھر روانہ ہوئے جبکہ باقی افراد کو قریب ہی کالٹیکس کے گیسٹ ہاؤس میں ٹھہرایا گیا۔

وشاکا پٹنم کوئی بڑا شہر نہیں تھا۔ خان صاحب کی آمد کی خبر سے پورے شہر میں اور خصوصاً والیٹر اپ لینڈ کے شاندار اور خوبصورت علاقے میں گویا ہلچل سی مچ گئی تھی۔ وہاں کلاسیکی موسیقی' شاستریہ سنگیت اور کرناٹک میوزک ..... سبھی کو سمجھنے والے ہندوستانیوں کی بڑی تعداد آباد تھی۔ اس وقت تک ٹی وی تو انڈیا میں نہیں آیا تھا لیکن آل انڈیا ریڈیو نے کلاسیکی موسیقی کی ترویج میں خاصا نمایاں کردار ادا کیا تھا اور کلاسیکل گانے والوں کو بھی شہرت دی تھی۔

Marfat.com

وشا کا پٹنم سابق ریاست وجے نگر کا ایک شہر تھا اور بے حد خوبصورت مقام تھا۔ وہاں کے لوگ شائستہ، تعلیم یافتہ اور باذوق تھے۔ کلاسیکی موسیقی کی پرکھ رکھتے تھے۔ خان صاحب کے وہاں پہنچنے کے دوسرے ہی روز ان کا کنسرٹ تھا۔ ان کے استقبال کے لئے ہال کے راستے میں پھول بچھائے گئے تھے۔ شری دیو چڈھا نے بہت اعلیٰ پیمانے کے انتظامات کیے تھے اور بہترین ساؤنڈ سسٹم وغیرہ کا اہتمام کیا تھا۔ شہر کے اونچے طبقے کے لوگ خان صاحب کو سننے کے لئے آئے تھے جن میں خوبصورت اور باوقار خواتین کی بھی ایک بڑی تعداد شامل تھی۔ بڑی بڑی خوبصورت آنکھوں والے منور علی خان بڑے وجیہہ نوجوان تھے اور عموماً خواتین کی توجہ کا مرکز بن جاتے تھے لیکن وہ اپنے والد اور اپنی گائیکی کے سوا کم ہی کسی طرف متوجہ ہوتے تھے۔

ایک سامع کی پرزور فرمائش پر خان صاحب نے راگ مندرا سپتک میں کچھ بول سنائے۔ باپ بیٹے کی آواز نے یکجا ہو کر سامعین پر گویا جادو کر دیا۔ سب خاموش اور دم بہ خود بیٹھے سن رہے تھے۔ اسی راگ میں رہتے ہوئے جب وہ دھن کو تیز کرتے ہوئے تین تال میں اس بول پر پہنچے:

باجے رے نیور باجے

موری پائیلیا

چھنن..... چھنن.....چھنن..... نن..... نن..... باجے

تو ہال تالیوں سے گونج اٹھا گانا ختم ہوا تو سامعین تالیاں بجاتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ اس کے بعد خان صاحب اور منور نے ہم آہنگ ہو کر راگ مالکونس اور دوسرے راگوں میں کئی بندشیں سنائیں۔ آخر میں وہ راگ دیس کی طرف آئے۔ یہ راگ

Marfat.com

شروع کرنے سے پہلے انہوں نے سوزو گداز سے لبریز آواز میں یہ یادگار جملہ کہا:

"عزیزو! شب کی محفل میں جب کوئی راگ دیس گاتا ہے تو ہم پردیسیوں کو اپنا دیس یاد آتا ہے۔"

**Bade Ghulam Ali Khan Sahib
with his beloved Sur Mandal**

رات گئے خان صاحب گاتے گاتے تھک گئے مگر سامعین سنتے سنتے نہ تھکے۔ آخر خان صاحب نے ہی معذرت کے ساتھ محفل برخاست کرنے کی اجازت چاہی۔ رات کے پچھلے پہر سامعین نہ جانے کن کن جہانوں کی سیر کر کے اپنی اپنی دنیا میں واپس آ گئے۔ دوسری رات عابد حسین کے بنگلے پر محفل تھی۔ عابد حسین والیٹر ڈسٹرکٹ کے کلکٹر تھے۔ ان کا بنگلہ بھی نہایت شاندار اور اعلیٰ طریقے سے آراستہ تھا۔ ان کی بیگم

Marfat.com

جارجی نہایت حسین اور خوش اطوار خاتون تھیں۔ انہوں نے اپنے طویل و عریض لان پر محفل کا اہتمام کیا تھا۔ یہاں بھی خان صاحب نے اپنے کمالِ فن سے سامعین کو سحر زدہ کر دیا۔ سپیدۂ سحر نمودار ہونے تک یہ محفل جاری رہی۔ خان صاحب کی ایک بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ پاک و ہند کی بہت سے علاقائی زبانوں میں بھی گا سکتے تھے اور ہر علاقے کی لوگ موسیقی سے ان کی گہری شناسائی تھی۔

صحت اچھی نہ ہونے کے باوجود خان صاحب نے مسلسل پانچ کنسرٹس میں شرکت کی ..... اور یہ کوئی آسان کام نہیں تھا۔ تاہم ان کنسرٹس نے گویا ان کی گرتی ہوئی صحت پر اچھے اثرات مرتب کیے۔ لوگوں نے جس والہانہ اور عقیدت مندانہ انداز میں انہیں سنا' جتنی داد دی اورم جتنے تحائف سے نوازا ..... اس نے گویا ان کے مفلوج جسم میں نئی روح پھونک دی۔ میرے کزن سریندر بھاٹیہ ان تمام کنسرٹس میں شریک رہے تھے۔ ان کے گھر کی روٹیوں کا ذائقہ خان صاحب کو بہت پسند آیا تھا چنانچہ جب خان صاحب حیدر آباد روانہ ہونے لگے اور لوگ انہیں رخصت کرنے اسٹیشن پر آئے تو میرے کزن نے اس خاص گندم کی ایک بوری بھی ان کے ہمراہ کر دی جو وہ اپنے گھر میں استعمال کرتے تھے۔ یوں انہوں نے خان صاحب کا سامان اور بڑھا دیا۔ اس تمام مہمان نوازی اور محبت پر خان صاحب انتہائی عاجزی سے بار بار یہی کہتے رہے "بس ..... یہ سب اللہ تعالیٰ کی مہربانی ہے۔

سینکڑوں افراد خان صاحب کو رخصت کرنے والیٹر اسٹیشن پر آئے تھے اور جب ٹرین روانہ ہوئی تو ان میں سے بعض رونے لگے۔

.....☆.....

Marfat.com

.....اور سورج ڈوب گیا

دسمبر 1967ء کی خوشگوار دھوپ میں خان صاحب حیدر آباد کے اسٹیشن پر پہنچے۔ نواب ظہیر یار جنگ کی سروقد' خوبصورت اور شاہانہ شخصیت کی مالکہ بیگم' خان صاحب اور ان کی فیملی کے استقبال کے لئے ریلوے اسٹیشن پر موجود تھیں۔ انہیں پلیٹ فارم سے کار تک لے جانے کے لئے وہیل چیئر بھی موجود تھی۔ بیگم فرید جہاں انہیں اور ان کے اہل خان کو اپنے ساتھ گاڑی میں بشیرِ باغ لے گئیں۔

خان صاحب 1940ء میں جوانی کے زمانے میں بھی لاہور سے آ کر نوابوں کی ان جاگیروں اور محلوں میں نجی محفلوں میں گا چکے تھے اور ان کی ریکارڈنگز بھی بیگم فرید جہاں نے محفوظ رکھی تھیں۔

اس زمانے کی یادوں نے خان صاحب کے ذہن پر یلغار کر دی۔ انہیں وہ وقت یاد آیا جب اسی جگہ کے دورے پر ان کے بھائی برکت علی خان بھی ان کے ساتھ تھے۔ ایک روز برکت علی خان' نواب ظہیر یار جنگ کے پاس پہنچے تو وہ بستر پر دراز تھے اور انہیں تیز بخار تھا۔ برکت خان صاحب بولے" میں گاتا ہوں ..... اپنی سی کوشش کرتا ہوں ..... اللہ نے چاہا تو آپ کا بخار کم ہو جائے گا۔"

Marfat.com

Bade Ghulam Ali's arrival in Vishakapatnam

انہوں نے گانا شروع کیا اور اس عالم میں گاتے رہے کہ انہیں اپنے تن بدن کا ہوش نہیں تھا۔ آدھے گھنٹے بعد نواب صاحب اٹھ بیٹھے۔ ان کا بخار واقعی بہت کم ہو چکا تھا۔ اب برکت خان صاحب دنیا میں نہیں تھے۔ 1963ء میں ان کا انتقال ہو چکا تھا۔صرف ان کی یادیں بڑے غلام علی صاحب کو افسردہ کرنے کے لئے باقی تھیں۔

دوسرے روز نواب صاحب' خان صاحب سے ملنے آئے۔ دونوں نے دوپہر کا کھانا ساتھ کھایا اور تقریباً پورا دن مختلف موضوعات پر باتیں کرتے گزارا۔ شہر میں لوگوں کو پتا چلا کہ بڑے غلام علی خان صاحب آئے ہوئے تھے تو جوق در جوق ان سے ملنے کے لئے آنے لگے۔ ان میں ہر شعبہ زندگی کے لوگ شامل تھے۔ صاحب ثروت لوگ' طالب علم' فنکار' پرستار' خیرخواہ' نواب زادے اور تہی دست ..... سبھی تھے۔

دسمبر کا مہینہ تھا کسی خاص واقعے کے بغیر' خیرو عافیت سے گزر گیا لیکن نیا سال اپنے ساتھ پریشانیوں کا پیغام لے کر آیا۔ جنوری 1968ء میں خان صاحب پر

Marfat.com

Father and son during a memorable evening in Vishakapatnam

دمے کا حملہ ہوا جس کے ساتھ برونکائٹس کی پیچیدگی بھی شامل تھی۔ نواب صاحب کے دوست' معروف ڈاکٹر منان کو بلوایا گیا۔ انہوں نے معائنہ وغیرہ کر کے دوائیں اور پرہیزی خوراک تجویز کر دی مگر ان چیزوں سے کوئی خاص افاقہ نہ ہوا۔ اصل مسئلہ یہ تھا کہ خان صاحب لیٹ نہیں پاتے تھے۔ لیٹنے کی صورت میں انہیں سانس لینے میں شدید دشواری ہوتی تھی۔ نتیجہ یہ کہ ان کی راتیں بیٹھ کر جاگتے گزرتی تھیں اور یہ بے آرامی ان کی صحت پر مزید برے اثرات مرتب کرتی تھی۔ اوپر سے ان کی خوراک برائے نام رہ گئی تھی۔ جلد ہی وہ بہت لاغر اور نحیف ہو گئے۔

منور نے ان کی حالت دیکھ کر مناسب سمجھا کہ لاہور میں اپنے بھائی کرامت خان اور کراچی میں دیگر عزیزوں کو اطلاع دے دیں۔ جنوری کے وسط تک خان صاحب کی بہن پون' ان کے شوہر خادم حسین اپنے بیٹے تصدق کے ساتھ کراچی سے آن پہنچے۔ خادم حسین اور پون' منور علی خان کے سسر اور ساس بھی تھیں۔ خادم حسین

Marfat.com

اپنی جوانی میں خاصے معروف کرکٹر تھے۔ ان کے بارے میں یہ واقعہ بے حد مشہور تھا کہ انہوں نے کرکٹ کے بادشاہ ڈان بریڈ مین کو ایک بار پہلی بال پر آوٹ کر دیا تھا۔ ان کا بیٹا تصدیق اچھا گلوکار تھا اور نیشنل ٹائر کمپنی میں کام کر رہا تھا۔ خان صاحب کے بڑے صاحبزادے کرامت علی خان بھی لاہور سے آن پہنچے۔ ان میں بھی گانے کی صلاحیتیں تھیں مگر وہ اس میدان میں محنت کرنے کی بجائے پڑھ رہے تھے۔ انہوں نے ہسٹری میں ماسٹرز کیا تھا اور لاہور میں فورڈ کمپنی میں کام کر رہے تھے۔

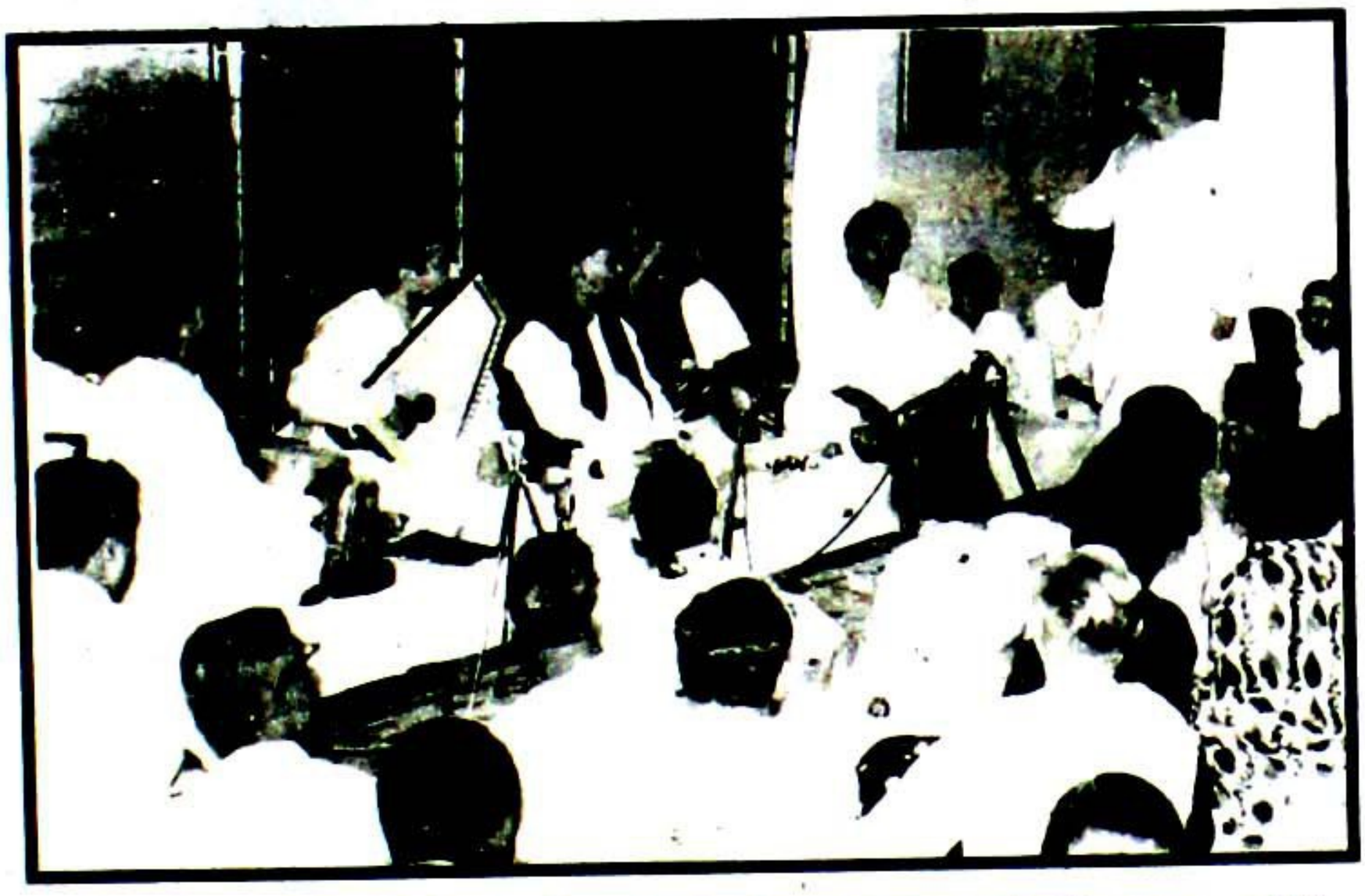

On stage L to R Amir Ali, Afaq Husain (tabla), Munawar Ali with Sur Mandal, Ustad Bade Ghulam Ali Khan, Laddan Khan (sarangi)

خان صاحب ازراہ مذاق ان سے کہا کرتے تھے ''برخوردار! بی اے' ایم اے کر کے کیا کرو گے؟ ہمارا آبائی پیشہ گانا بجانا ہے۔ موسیقی ہمیں ورثے میں ملی ہے اور یہ فن سُر کی دیوی نے خود ہمارے خاندان کو دیا ہے یہ ایک عظیم تحفہ ہے۔ تم میں صلاحیت ہے۔ تم بڑے گویے بن سکتے ہو۔'' مگر کرامت نے ان کی مذاق کی بات مذاق میں ہی ٹال دی۔

Marfat.com

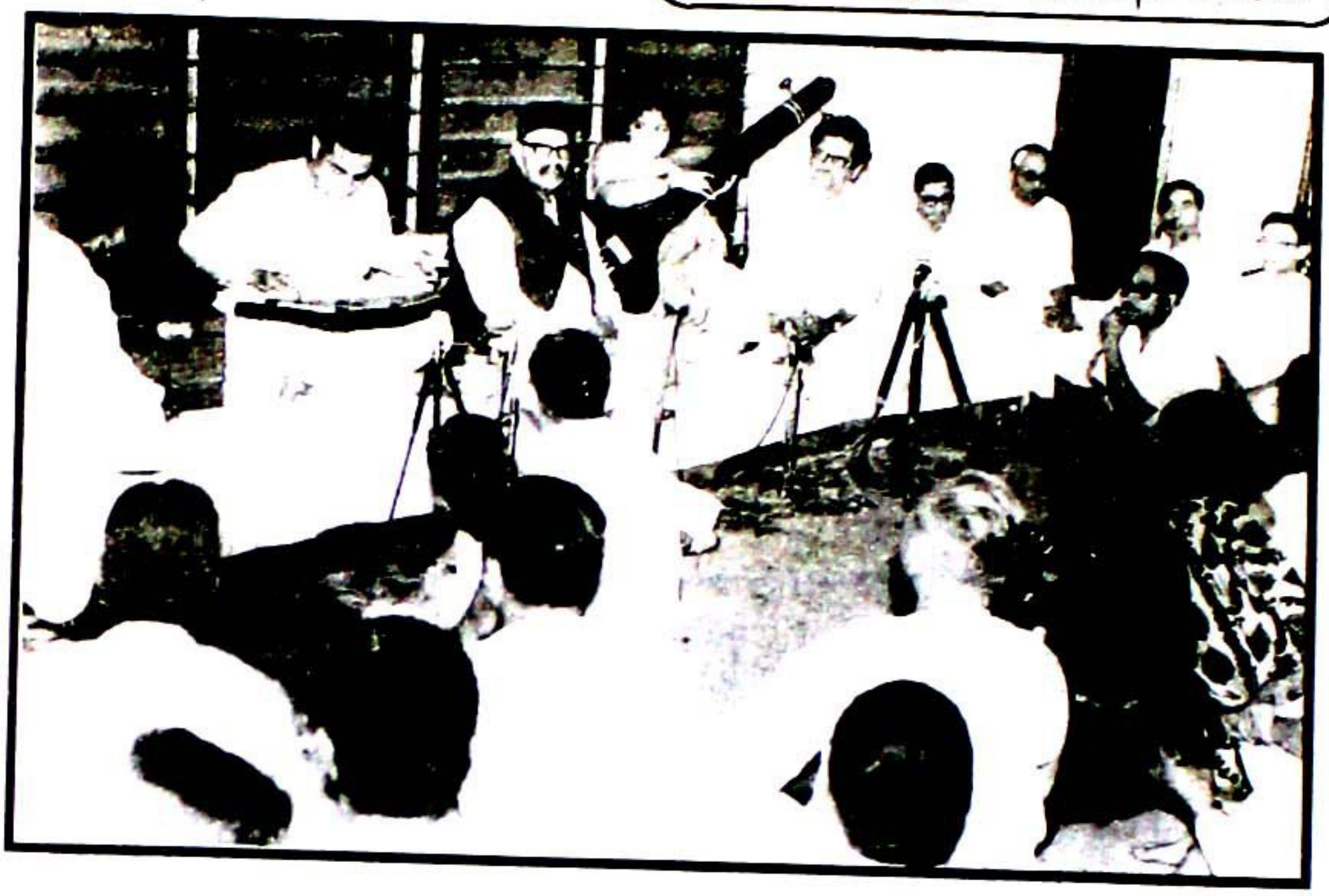

میں جنوری 1968ء میں اپنے والد سے ملنے بمبئی گئی۔ میری والد آرمی سے ریٹائر ہو چکے تھے اور ان دنوں ''برٹش ڈرگ ہاؤس'' کے چیئرمین کی حیثیت سے کام کر رہے تھے وہ ایک دوا ساز کمپنی تھی۔ مجھے خبر مل چکی تھی کہ حیدر آباد میں میرے استاد علیل ہیں اور میرا دل ان سے ملنے کو بے تاب تھا۔ ان کے لئے میرے دل میں ویسی ہی محبت اور چاہت تھی جیسی کسی بیٹی کے دل میں باپ کے لئے ہوسکتی ہے۔ انہوں نے بھی مجھے باپ جیسا ہی پیار دیا تھا۔ ان کی بیگم نے تو مجھے باقاعدہ منہ بولی بیٹی بنایا ہوا تھا۔

بمبئی بہت پرہجوم اور گنجان آباد شہر ہے۔ ایک روز میں ٹریفک کے مسائل کو بالائے طاق رکھتے ہوئے ''ہمت نواس'' چلی گئی۔ اس بلڈنگ کے جس فلیٹ میں کبھی خان صاحب رہا کرتے تھے اس کی دیوار پر ابھی تک ان کے نام کی تختی لگی ہوئی تھیں۔ میں نے گھنٹی بجائی تو گنگا بائی باہر آئیں۔ اب وہ اس فلیٹ میں رہتی تھیں۔ میں گو کہ پہلے کبھی ان سے نہیں ملی تھیں لیکن میں نے انہیں پہچان لیا کیونکہ خان

Marfat.com

صاحب مجھے ان کے بارے میں سب کچھ بتا چکے تھے۔ وہ گول مٹول' معصوم سے چہرے والی پستہ قد خاتون تھیں۔ ان کی عمر ستر سے اوپر تھی۔

میں نے جب ان سے اپنا تعارف کرایا تو وہ بولیں ''میں غائبانہ تمہیں جانتی ہوں۔ تم بڑے غلام علی کی شاگرد ہو..... اور غلام علی میرے لئے بھائیوں کی طرح ہے۔''

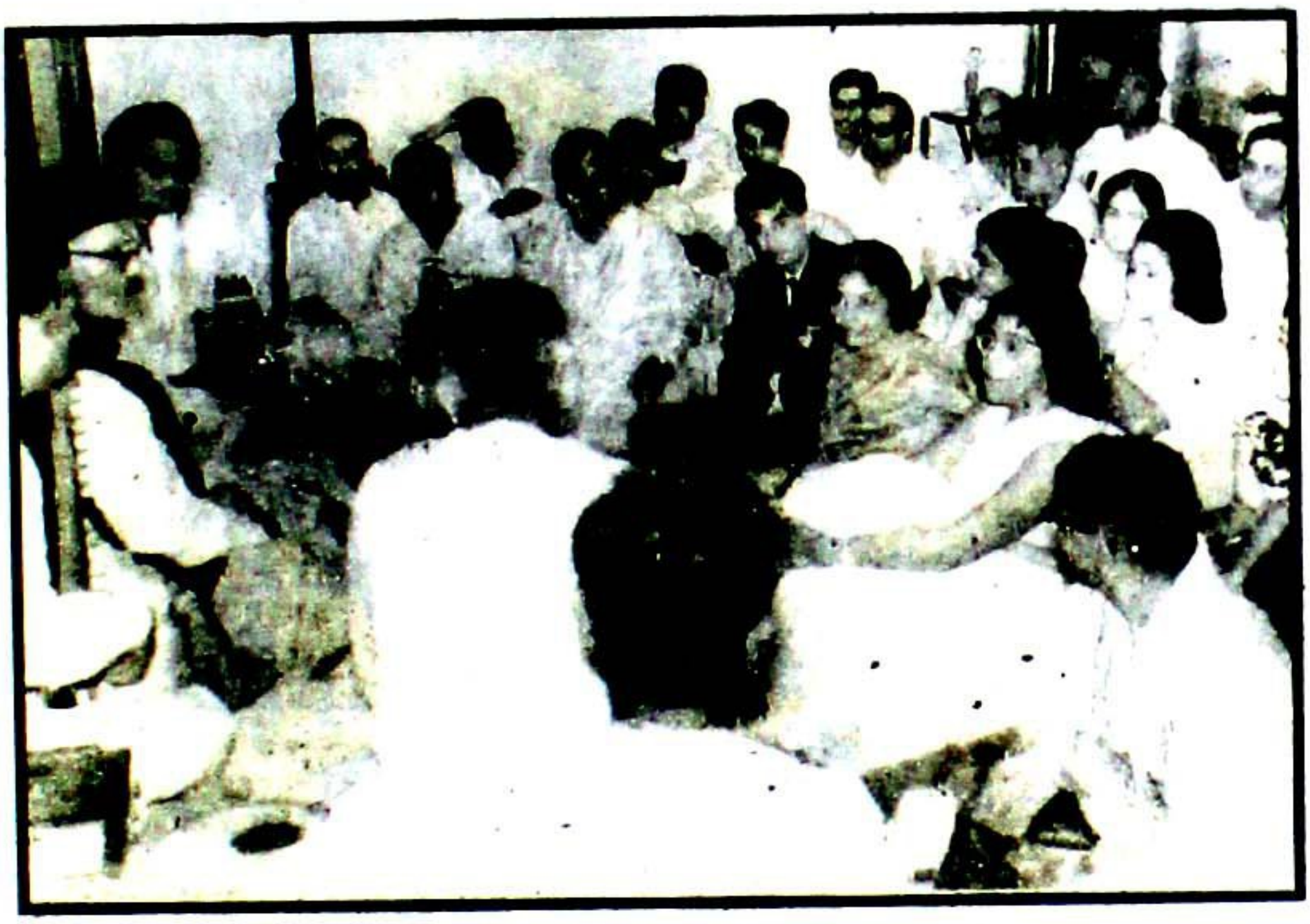

Concert in Vishakapatnam

وہ محبت سے مجھے اندر لے گئیں میں نے عقیدت سے اس گھر کے گوشے گوشے کو دیکھا جہاں میرے استاذ میرے گرو رہا کرتے تھے۔ ان کے بارے میں باتیں کرتے ہوئے ..... یادیں تازہ کرتے ہوئے گنگا بائی بھی اداس ہو گئیں۔ انہیں بھی معلوم تھا کہ خان صاحب حیدرآباد میں بیمار ہیں' ان کا دل بڑھ چکا ہے اور ان کے لئے سانس لینا مشکل ہو گیا ہے۔ ان کی سوگوار صورت دیکھ کر میں نے وہیں بیٹھے بیٹھے فیصلہ کیا کہ میں خان صاحب سے ملنے حیدرآباد جاؤں گی۔

Marfat.com

میرے والد نے دوسرے روز جہاز پر میری سیٹ بک کرا دی اور میں تمام سفر کے دوران دعا کرتی رہی کہ میرے گرو صحت یاب ہو جائیں۔ سکندر آباد ائیر رپورٹ پر اتر کر میں نے ٹیکسی لی اور بشیر باغ روانہ ہو گئی۔

Malti and Begum Allah Rakhi

خان صاحب کسی اطلاع کے بغیر' اچانک مجھے سامنے پا کر حیران رہ گئے۔ وہ اس وقت تخت پر بیٹھے تھے۔ ان کی بہن پون اور بہنوئی خادم حسین ان کے دائیں بائیں کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ مجھے دیکھ کر خان صاحب کے چہرے پر ایک فخریہ سی چمک آ گئی اور وہ بہن بہنوئی کو مخاطب کر کے بولے ''میرے تمام شاگردوں میں سے صرف

Marfat.com

مالتی میری بیماری کی خبر سن کر مجھ سے ملنے آئی ہے۔ دراصل یہ میری شاگرد نہیں ..... بلکہ بیٹی ہے۔"

Shishya Malti Gilani doing riyaz with Ustad Amir Ali Khan

انہیں کلکتہ سے آئے صرف دو ماہ ہوئے تھے مگر ان دو مہینوں میں وہ بے حد لاغر اور نحیف ہو گئے تھے۔ امّاں بھی مجھ سے اسی محبت سے ملیں۔ جب لوگوں کی بھیڑ چھٹی تو خان صاحب راز دارانہ سے انداز میں مجھ سے بولے "پتر! تم جانا مت ..... یہیں رکنا ..... ابھی بہت سی چیزیں ہیں جو میں تمہیں سکھانا چاہتا ہوں ..... شاید زندگی پھر موقع نہ دے ....."

میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ صحیح معنوں میں استاد تھے۔ باپ کی طرح شفیق بھی تھے اور اپنے فن کا زیادہ سے زیادہ ورثہ مجھ سے منتقل کرنے کی مخلصانہ خواہش بھی ان کے دل میں کمزور نہیں پڑی تھی۔ کلکتہ میں گزشتہ چار برسوں کے دوران میں انہوں نے جس خلوص اور محنت سے مجھے جو کچھ سکھایا تھا وہ کچھ کم نہیں تھا۔ ان تمام

Marfat.com

لمحوں کی یادیں قطار در قطار میرے تصور کے سامنے سے گزر رہی تھیں۔

Malti Gilani and Begum Allah Rakhi
She loved and guided me always
and died in August 1996

دوسرے روز ان کی طبیعت کچھ بہتر لگ رہی تھی اور اسی روز سے انہوں نے مجھے واقعی مزید سکھانا شروع کر دیا۔ وہ گویا اپنے علم کا زیادہ سے زیادہ خزانہ مجھ تک منتقل کرنے کے لئے بے قرار تھے اور اس ضمن میں اپنی صحت کی خرابی کو بھی خاطر میں نہیں لا رہے تھے۔ آخر ان کے عزیزوں اور رشتے داروں کے پاکستان واپس جانے کا وقت

Marfat.com

آ گیا۔ تب وہ وطن کو یاد کر کے اور زیادہ اداس ہو گئے۔ یہ احساس انہیں تڑپا رہا تھا کہ وہ اپنے وطن واپس نہیں جا سکتے تھے۔

Bade Ghulam Ali Khan Sahib laid to rest in Daaiyra Meer Momin in Hyderabad, April 23, 1968

ان کے بڑے بیٹے کرامت علی یہ کہہ کر انہیں تسلی دینے کی کوشش کی "ابا جی! وطن سے دوری اور سیاست کی سفاکیوں کے بارے میں سوچ سوچ کر خود کو اذیت نہ پہنچائیں۔ دنیا میں سب کام ہماری مرضی سے نہیں ہوتے۔ آپ کو اللہ تعالیٰ نے جو عزت اور جو کامیابیاں عطا کیں، صرف ان کے بارے میں سوچا کریں۔"

ان کے اعزہ و اقارب کو حیدر آباد میں ایک ماہ ہو گیا تھا۔ ان کے ویزے ختم ہو رہے تھے۔ آخر وہ واپس چلے گئے اور خان صاحب جو انہیں دیکھ کر گویا نئے سرے سے جی اٹھے تھے، ایک بار پھر دل شکستہ اور مضمحل ہو گئے۔ ان کا اپنا بیٹا ان کے وطن

Marfat.com

میں تھا مگر وہ وطن ان کے لئے اجنبی ہو چکا تھا۔ ''غیر ملک'' بن چکا تھا۔ ملکوں کی تقسیم اسی طرح خون کے رشتوں کو تقسیم کرتی ہے۔ تقسیم ہند کی بنیادوں میں تو ویسے بھی لاکھوں انسان کا خون ہے اور اس موقعے پر درندگی اور بربریت کے جو مظاہرے ہوئے ان کے بدنما نقوش انسانیت کے وجود پر سے شاید کبھی نہ مٹ سکیں۔ مغنیوں' مصوروں' افسانہ نگاروں' شاعروں کے دل تو زیادہ نازک ہوتے ہیں۔ ان کی تخلیقات میں آج بھی اس درد کی پکار محسوس کی جا سکتی ہے جس نے اس سفاکانہ تقسیم کی کوکھ سے جنم لیا۔

عزیزوں' رشتے داروں کے جانے کے بعد خان صاحب جیسے یک دم بجھ سے گئے۔ بہت دیر تک وہ سُر منڈل لیے کمرے میں بیٹھے رہے اور راگ دیسی توڑی میں دھیمی آواز میں اپنی بندش گاتے رہے۔ ان کی فرمائش پر میں ان کا ساتھ دیتی رہی۔ درحقیقت اس وقت ہم دونوں کے دل رو رہے تھے۔

22 اپریل 1968ء کی صبح انہوں نے اپنے چہیتے بیٹے منور کو بلایا اور کہا ''مینو! مجھے اٹھا کر باہر برآمدے میں بٹھا دو .....'' پھر جیسے انہیں کوئی خیال آیا اور بولے ''مینو پتر! بس اب میں صرف ایک دن اور تمہیں تکلیف دوں گا۔ پھر تم ان بھاری ذمے داریوں کے بوجھ سے آزاد ہو جاؤ گے۔''

منور علی آبدیدہ ہو گئے اور بولے ''ابا جی! ایسی باتیں نہ کریں۔ آپ کی صحت اب بہتر ہو رہی ہے۔''

ہم سب جانتے تھے ان کی صحت بہتر نہیں ہو رہی تھی۔ وہ ذیابیطس کے مریض بھی تھے۔ سانس انہیں صرف بیٹھ کر آتا تھا ان کی خوراک نہ ہونے کے برابر رہ گئی تھی۔ تاہم اس روز وہ تمام دن خوشگوار انداز میں باتیں کرتے رہے۔

Marfat.com

23 اپریل 1968ء کو علی الصبح مرغ نے بانگ دی تو خان صاحب نے منور کو مخاطب کیا ''مینو! سنا تم نے؟ مرغا اذان دے رہا ہے .... مرغے کی بانگ راگ توڑی میں ہے ....'' پھر انہوں نے سرگوشی کے سے انداز میں منور علی کی ماں کا نام لیا .... کلمہ پڑھا اور اس کے ساتھ ہی نہایت پرسکون انداز میں ان کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔ اس روز موسیقی کے افق کا یہ آفتاب غروب ہو گیا! یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ اسی تاریخ کو حضور رسالتمآب ﷺ کے نواسے اور چوتھے امام، حضرت امام زین العابدین کا یوم شہادت تھا۔

استاد بڑے غلام علی خان صاحب کے انتقال کی خبر سن کر گویا پورا شہر امنڈ آیا۔ ان کے جنازے میں خلق خدا کی ایک بڑی تعداد نے شرکت کی۔ ان میں سے بہت سے گریہ و زاری کر رہے تھے۔ ماحول پر سوگواری کے ساتھ ساتھ ایک بے عنوان سی تاریکی پھیلتی محسوس ہو رہی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ روشنی کا کوئی مینار گر گیا ہے۔

حیدر آباد شہر کے علاقے چار مینار میں ''دائرہ میر معین'' کے نام سے ایک قبرستان ہے جسے ایک خاص تقدس حاصل ہے کہ یہاں ایک ولی اور بزرگ میر معین دفن ہیں۔ استاد بڑے غلام علی خان صاحب کو اسی قبرستان میں دفن کیا گیا۔ گویے موسیقار اور فنکار ہی نہیں، عام افراد بھی بڑی تعداد میں ان کی قبر پر آتے ہیں اور عقیدت کے پھول نچھاور کرتے ہیں۔

ع خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

......☆......

Marfat.com

روایتوں کے امین

استاد بڑے غلام علی خان صاحب کے فرزند استاد منور علی خان بھی اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔ ان کے صاحبزادے بڑے غلام علی صاحب کے پوتے رضا علی خان اب گائیکی کے میدان میں اپنے جوہر دکھا رہے ہیں۔

استاد رضا علی خان 8 اگست 1962ء کو پیدا ہوئے۔ ان کا تعلق قصور ''پٹیالہ گھرانے'' سے ہے۔ انہوں نے موسیقی کی ابتدائی تعلیم تو اپنے دادا استاد بڑے غلام علی خان سے ہی حاصل کی۔ ان کے انتقال کے بعد انہوں نے اپنے والد کے زیر سایہ تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا۔

رضا علی خان ملک کے ہونہار ترین نوجوان' کلاسیکل گانے والے ہیں۔ وہ تمام اہم میوزک کانفرنس میں شرکت کر چکے ہیں۔ یورپ اور مشرق وسطی کے متعدد دورے کر چکے ہیں اور باذوق سامعین کی ایک بہت بڑی تعداد کے سامنے اپنے فن کا مظاہرہ کر چکے ہیں۔ وہ سرکاری طور پر انڈیا کے ثقافتی نمائندے کی حیثیت سے باترتیب 1984ء اور 1986ء میں پاکستان اور افغانستان کا دورہ بھی کر چکے ہیں۔ خیال' غزل اور ٹھمری کی گائیکی میں ان کا انداز ہ اپنے مرحوم دادا جیسا ہے۔

.....☆.....

Marfat.com

استاد بڑے غلام علی خان مرحوم کی گائیکی کی روایتوں اور فنی ورثے کو لے کر آگے بڑھنے والے دوسرے دو نوجوان استاد مظہر علی خان اور استاد جواد علی خان صاحب ہیں۔ یہ دونوں بھی استاد بڑے غلام علی خان مرحوم کے پوتے اور کرامت علی خان صاحب کے فرزند ہیں۔ ان کا تعلق ''قصور پٹیالہ گھرانے'' سے ہے اور انہیں اس صدی کے عظیم ترین گویوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ دونوں نوجوان گویوں کے انڈیا اور دیگر ممالک میں بہت سے کنسرٹ ہو چکے ہیں۔ ان کے کنسرٹس میں سامعین کی بہت بڑی تعداد کھنچی چلی آتی ہے۔ انہوں نے نہایت مہارت و مشاقی سے اپنے عزیز دادا کا گائیکی کا انداز اپنایا ہے۔ سُر اور لے پر انہیں مکمل عبور حاصل ہے۔ ان کی گائیکی سامعین پر سحر طاری کر دیتی ہے۔ خیال' ٹھمری اور داد را کی گائیکی میں انہوں نے خاندانی روایتوں کو آگے بڑھانے کے ساتھ خود بھی خوبصورت تجربات کیے ہیں جنہوں نے سامعین کو ہمیشہ متاثر کیا ہے۔ گائیکی کی نزاکتوں اور اس فن کے اسرار و رموز یہ بہ خوبی سمجھتے ہیں۔ گھرانے کی روایات کو نبھانے کے ساتھ ساتھ انہوں نے اپنی انفرادیت بھی قائم کی ہے۔

استاد مظہر علی خان ان اور استاد جواد علی خان صاحب آل انڈیا ریڈیو اور ٹی وی کے ٹاپ گریڈ کے فنکار ہیں۔ ان کی ایک آڈیو ٹیپ ''یادِ سب رنگ'' کے عنوان سے حال ہی میں ویسٹن کمپنی نے ریلیز کی ہے جس میں انہوں نے بہترین انداز میں ٹھمری اور داد را پیش کیا ہے اور اس مجموعے کو اپنے دادا' استاد بڑے غلام علی خان کے نام معنون کیا ہے۔

.....☆.....

Marfat.com

Marfat.com

المدینہ دارالاشاعت

یوسف مارکیٹ غزنی سٹریٹ 38 اُردو بازار لاہور

042-7320682 ,7312801

Marfat.com